ایصالِ ثواب پر ایک تحقیقی نظر

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

إكمال الخطاب في تحقيق إيصال الثواب

یعنی

ایصالِ ثواب پر ایک تحقیقی نظر

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : الیصال ثواب پر ایک تحقیقی نظر

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ،بنگلور

صفحات : ۱۶۲

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

باب دوم
ایصالِ ثواب پر چند شبہات کے جوابات

باب سوم
ایصالِ ثواب کے سلسلے میں بے اعتدالیاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

الحمدُ للّٰہ ربِّ العالمین والصّلاۃُ والسّلامُ علٰی سیّدِ المُرسَلِین،

أما بعد:

زندوں کی جانب سے کوئی نیک عمل کر کے اس کا ثواب مرحومین کو پہنچانا، ایصالِ ثواب کہلاتا ہے اور یہ بات مخفی نہیں کہ ایصالِ ثواب کی متعدد صورتیں لوگوں میں معروف و رائج ہیں، جیسے دعا و استغفار، صدقہ و خیرات، نماز و روزہ، حج و عمرہ، ذکر و تلاوت، وغیرہ، ان صورتوں میں سے دعا و استغفار سے مرحومین کو نفع ہونا اور اس کا ثواب پہنچنا باتفاق اہل سنت مسلم ہے اور ان کے علاوہ جو مالی عبادات ہیں، جیسے صدقہ و خیرات، ان کا ثواب مرحومین کو پہنچانے کے جواز وصحت میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں؛ بل کہ اس پر بھی سبھی ائمہ و علمائے اہلِ سنت کا اتفاق ہے۔ البتہ بدنی عبادات جیسے نماز و روزہ، ذکر و تلاوت کے بارے میں سلف سے تھوڑا سا اختلاف چلا آرہا ہے کہ مرحومین کو ان بدنی عبادات کا ثواب پہنچانے سے ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ یہ عمل درست و جائز ہے یا نہیں؟

ہم نے جو یہ کہا ''تھوڑا سا اختلاف'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ائمہ سلف میں سے بعض تو وہ ہیں، جو اس کے جواز و مشروعیت کے قائل ہیں اور بعض دوسرے حضرات کے اس بارے میں دو قول ہیں: ایک جواز کا، ایک عدم جواز کا۔ پھر ان میں سے بعض حضرات اس کو چند شرطوں کے ساتھ جائز کہتے ہیں۔ اس طرح اس سلسلے کا یہ اختلاف کافی ہلکا ہو جاتا

ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

مگر حیرت ہے کہ آج کل بعض لوگ ایصالِ ثواب کو مطلقاً ناجائز و بدعت و گمراہی کہہ کر اس کا رد و انکار کرتے ہیں ؛ حالاں کہ اولاً تو اس کی بعض صورتوں میں کوئی اختلاف سرے سے ہے ہی نہیں ؛ بل کہ بالاجماع وہ صورتیں ایصالِ ثواب کی مشروع و جائز ہیں اور بعض صورتیں وہ ہیں، جن میں سلف سے اختلاف چلا آ رہا ہے اور اس میں جس طرح ایک نقطۂ نظر عدمِ جواز کا ہے، اسی طرح دوسرا نقطۂ نظر جواز کا بھی موجود ہے۔ جب سلف میں خود اس میں اختلاف رہا ہے تو اس کو مطلقاً رد کرنا اور اس کو بدعت و گمراہی قرار دینا گویا سلف کو بدعتی کہنے کے مترادف ہے۔

اس تحریر میں ہم نے یہی واضح کرنا چاہا ہے کہ ایصالِ ثواب کی بعض صورتیں متفق علیہ ہیں، جن میں کوئی اختلاف کسی فقیہ و امام کا نہیں ہے اور بعض صورتیں وہ ہیں جن میں اختلاف تو پایا جاتا ہے، تاہم ان میں بھی جمہور ائمہ کا مسلک جواز ہی کا ہے، جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کو دکھائیں گے۔

نیز ہم نے یہاں اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ایصالِ ثواب کی ان متعدد صورتوں میں سے ہر صورت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا شرعی حکم بیان کیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی بیان کی جائے، نیز اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ اس سلسلے میں ائمہ دین کے مسالک کا ذکر بھی ان کی معتبر کتب کے حوالے سے کریں۔

اور چوں کہ ایصالِ ثواب کے مسئلے میں زیادہ تر بحث و مباحثہ بعض لوگوں کی جانب سے قرآن کریم کی تلاوت سے ایصالِ ثواب پر کیا جاتا ہے اور عوام الناس کو اس مسئلے میں خواہ مخواہ متوحش و پریشان کیا جاتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کو بدعت و گمراہی قرار دیا جاتا ہے؛ اس لیے ہم نے اس مسئلے پر بھی خصوصیت کے ساتھ کلام کیا ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور ائمہ کے مسالک کی وضاحت بھی پیش کی ہے اور خاص طور پر ہم نے علمائے اہلِ حدیث میں سے بعض اہم شخصیات کے فتاوی بھی اس سلسلے میں ان کی معتبر

کتابوں کے حوالے سے نقل کر دئے ہیں؛ تاکہ ایک جانب اہل حدیث حضرات کے لیے بھی دلیل و حجت رہے اور خود ان کو ان کے اکابر حضرات کے فتاوی معلوم ہو جائیں؛ کیوں کہ عموماً یہی حضرات عوام الناس کو اس سلسلے میں پریشان کرتے اور قرآن خوانی کا ثواب نہ پہنچنے کا دعوی کرتے ہیں۔

اس تحریر سے مقصود حق کی وضاحت اور ائمہ سلف کے مسلک کی تحقیق ہے؛ لہذا اس کو اسی پر محمول کیا جائے اور حق کو قبول کرنے اور عمل کرنے کی کوشش کی جائے یا کم از کم جو اس کو حق سمجھتا ہے اس کو اس پر عمل کرنے دیا جائے۔

اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس تحریر کو متلاشیانِ حق کے لیے مفید و نافع بنائیں اور احقر کے لیے ذخیرۂ آخرت بنا کر نجات کا ذریعہ بنائیں۔

محمد شعیب اللہ خان

جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۱۰ر صفر المظفر ر ۱۴۲۷ھ

تمہید

ایصالِ ثواب کے جواز و عدم جواز اور اس کی تفصیلات پر کلام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور تمہید چند بنیادی باتیں عرض کر دی جائیں۔

ایصالِ ثواب کی حقیقت

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایصالِ ثواب کی حقیقت کیا ہے؟ ایصالِ ثواب کی حقیقت دو باتوں پر مشتمل ہے:

ایک تو یہ کہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ مؤمن کی حیاتِ دنیوی اس کے لیے ذخیرۂ آخرت بنانے کی ایک سبیل ہے، جس پر چل کر وہ اپنے ایمان و یقین اور اعمال و عبادات کے ذریعے قربِ ربانی پاتا، راہِ جنت کا راہرو بنتا اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، یہ سارے دینی طریقے اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے کہ اسی نے محض اپنے فضل و کرم سے انسان کو ایمان کی راہ دکھائی اور ان کے لیے شریعت نازل فرمائی؛ تا کہ بندے راہِ نجات پا کر نجات یافتہ ہوں اور جہنم میں جانے سے بچ سکیں؛ لیکن اگر کوئی بندہ اس دنیا کی زندگی میں ایمان لانے کے باوجود اپنی دینی ذمہ داریوں، شرعی اعمال اور اسلامی عبادات میں کوتاہی کا مرتکب ہوا اور اس کی وجہ سے وہ اللہ کی نظر میں نا کام و گناہ گار ہو گیا اور اسی حالت میں اس دارِ فانی سے چلا گیا یا ایک شخص نیک و صالح تھا اور اسی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گیا تو یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مؤمن بندے کے وفات پا جانے کے بعد اس کے لیے کیا کوئی ایسی چیز ہے، جس سے وہ بعدِ وفات اللہ کی

نظر میں کامیاب ہو سکے؟ یا اپنے گناہگارانہ حال سے نیکی و صلاح کے حال میں منتقل ہو جائے؟ یا یہ کہ کوئی نیک و صالح شخص وہاں اپنے درجات قرب میں ترقی کر سکے؟

''ایصالِ ثواب'' درحقیقت اسی سوال کا جواب ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا رحمتوں اور کرم نوازیوں نے جہاں مؤمن بندوں کے لیے ان کی زندگی میں نیکی و طاعت سے ثواب حاصل کرنے اور ذخیرۂ آخرت بنانے کی سبیل بتائی، وہیں اس کی بے پناہ مہربانیوں اور لامحدود شفقتوں نے بعد موت بھی ان کے لیے یہ راہ و سبیل کھول رکھی ہے؛ تاکہ ان کے لیے نجاتِ عُقبیٰ کی اُمید زیادہ سے زیادہ باقی رہے اور وہ اپنے درجاتِ قرب و منازلِ آخرت میں ترقی کر سکیں۔ اور وہ سبیل اور راستہ یہی ''وصولِ ثواب'' یا ''ایصالِ ثواب'' سے معروف و موسوم ہے۔

اور اس وصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کی ایک صورت یہ ہے کہ مرحوم شخص اپنی زندگی میں کوئی ایسی طاعت و عبادت انجام دے جائے جس کا ثواب بعد وفات بھی جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے متعلقین و دوست احباب وغیرہ اس مرحوم شخص کو ثواب پہنچانے کا کوئی بندوبست کریں اور یہ ظاہر ہے کہ وہ شریعت کی روشنی میں طاعات و عبادات کی بجا آوری ہی ہو سکتی ہے، جن سے مرحوم کے نامۂ عمل میں ان طاعات و عبادات کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

الغرض ایصالِ ثواب دراصل وفات یافتہ مؤمن بندوں کے ساتھ اللہ کے فضل و احسان کی ایک شکل و صورت ہے، جس سے وہ اپنی مابعد الموت زندگی میں بھی مستفید ہوتا رہتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کے ساتھ اس دنیوی زندگانی میں اپنے فضل و کرم کی بارشیں برساتے رہتے ہیں اور متعدد و بے پناہ صورتیں اس کی جاری فرماتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ایصالِ ثواب مؤمن بندے کے حق میں اس کے متعلقین اور دوست و احباب کی جانب سے ایک درجے میں رشتہ داری کے حقوق اور دوستانہ حسن سلوک کا مظاہرہ ہے؛ کیوں کہ جب کوئی انسان مرجاتا ہے، تو اس کے خیالات و احساسات باقی

رہتے ہیں، وہ اس کے بعد بھی چاہتا ہے کہ اس کے رشتہ دار اور دوست واحباب اس کے قدیم تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہیں؛ لہذا شریعت نے اسی فطری جذبے کے تحت ایصالِ ثواب کا طریق مشروع کردیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغة" میں اس سلسلے میں ایک محققانہ بحث کی ہے، آپ نے جو لکھا ہے اس کی شرح وترجمانی فرماتے ہوئے عالم اسلام کی معروف ومقبول شخصیت محدث کبیر علامہ سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم نے لکھا ہے:

> ''میت کے ساتھ حسنِ سلوک کی دوسری صورت یہ ہے کہ میت کو دعا وصدقہ کے ذریعے فائدہ پہنچایا جائے؛ کیوں کہ جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی روح کے احساسات اور ادراکات باقی رہتے ہیں، یعنی حس مشترک وغیرہ ادراک کرنے والی صلاحیتوں کا عمل جاری رہتا ہے۔ نیز زندگی کے خیالات و مزعومات بھی برقرار رہتے ہیں .... پس جب دنیا میں اللہ کے نیک بندے میت کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں، تو ان کی توجہات سامیہ بارگاہ عالی تک پہنچتی ہیں، پس ماندگان مشقت اٹھا کر کوئی بڑی خیرات کرتے ہیں، تو یہ دعا وصدقہ اللہ تعالیٰ کے انتظام کے مطابق میت کے لیے نافع بن جاتے ہیں اور یہ دعا وصدقہ اللہ تعالی کے اس فیضان سے ملتے ہیں، جو بارگاہ عالی سے میت پر نازل ہوتا ہے اور اس کو میت کی خوش حالی کے لیے تیار کرتے ہیں۔(۱)

الغرض ایصالِ ثواب اگر ایک پہلو سے دیکھا جائے تو اس کی حقیقت اللہ کے رحم و کرم سے میت کے لیے دنیا کی طرح آخرت میں بھی نجات یا ترقی درجات کی راہ ہموار

(۱) رحمة الله الواسعة:۳/۶۳۶

کرنا ہے اور ایک اور پہلو سے دیکھا جائے، تو وہ رشتہ داروں اور دوست و احباب کی جانب سے اس کے ساتھ حق رشتہ داری کو نباہنا اور حسنِ سلوک کا معاملہ پیش کرنا ہے۔

ایصالِ ثواب کی چند صورتیں

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ ایک مؤمن کے وفات پا جانے کے بعد اس کو ثواب ملنے کی چند شکلیں ہیں:

- ان میں سے ایک صورت تو یہ ہے کہ مرحوم کوئی ایسا عملِ طاعت کر جائے جو بعد میں بھی باقی رہے۔
- اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اور دوست و احباب خود کچھ نیکیاں و طاعات بجالائیں اور ان کا ثواب مرحوم کو پہنچادیں۔

پھر جو عبادات و نیکیاں مرحوم کی جانب سے کوئی دوسرا بجالائے، وہ چار قسم کی ہوسکتی ہیں:

- ایک: عباداتِ قلبیہ، جیسے ایمان، یقین۔
- دوسرے: عبادات مالیہ جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ۔
- تیسرے: عبادات بدنیہ، جیسے نماز وروزہ، ذکر وتلاوت، وغیرہ۔
- چوتھے: وہ عبادات جو جسم و جان اور مال و دولت دونوں سے مرکب ہوں، جیسے حج وعمرہ۔

مگر ایصالِ ثواب کے سلسلے میں یہ چاروں قسمیں برابر نہیں ہیں؛ بل کہ ان میں سے پہلی قسم اعمالِ قلبیہ کے بارے میں یہ طے ہے کہ ان کا ثواب کسی کو نہ بخشا جا سکتا ہے اور نہ وہ کسی اور کو نفع دے سکتے ہیں۔

عبادات قلبیہ سے ایصالِ ثواب نہیں ہوسکتا

یہ تیسری بات ہے، چناں چہ علمائے کرام وفقہائے عظام نے بہت وضاحت وصراحت سے یہ لکھ دیا ہے کہ ان چار قسم کی عباوات میں سے پہلی قسم یعنی عبادات قلبیہ سے ایصالِ ثواب نہیں ہوسکتا، مثلاً کسی غیر مؤمن کو کسی مؤمن کے ایمان کا ثواب نہیں پہنچایا جاسکتا اور نہ یہ میت کے حق میں کوئی نفع بخش ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ کسی کا ایمان کسی اور کے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔

قرآن مجید میں آیت آئی ہے:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى.﴾ (سورة النجم: ۳۸-۳۹)

ترجمہ: یہ کہ کوئی انسان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ کسی انسان کو سوائے اس کی محنت کے کچھ اور نہیں ملے گا۔

بیشتر علما کے نزدیک اس آیت میں یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو صرف اپنے ہی ایمان کا ثواب ملے گا، کسی اور کے ایمان سے اس کو کوئی نفع نہ ہوگا؛ لہٰذا باپ کو اپنی اولاد کے ایمان سے یا اولاد کو اپنے والدین کے ایمان سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا، جب کہ وہ خود ایمان دار نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے باپ کو حضرت ابراہیم کا ایمان کام نہیں آیا اور نہ ان کی دعا واستغفار اس کے حق میں قبول ہوئے؛ بل کہ جب آپ نے اپنے باپ کے حق میں دعا واستغفار کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو اس سے یہ کہہ کر منع کردیا گیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے اور پھر آپ اس کے حق میں دعا سے رک گئے۔

اسی طرح ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب کو آپ کا ایمان کام نہیں آیا اور وہ جہنم رسید ہوا۔

بلکہ حضرت ابو طالب، جو حضرت آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے اور آپ کی پرورش و دیکھ ریکھ میں نمایاں حصہ ان کا رہا ہے، ان کو بھی آپ کے ایمان سے نفع نہ ہوا، کیوں کہ وہ خود ایمان دار نہیں تھے؛ بل کہ ان کے حق میں دعائے مغفرت سے بھی آپ کو منع کر دیا گیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے:

''جب ابو طالب کی موت کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس جا کر ایمان لانے کی پیش کش کی اور فرمایا:

" أيْ عَمِّ، قُلْ:لاَ إلٰهَ إلاَّ اللّٰهُ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَکَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ."

ترجمہ: اے چچا! لا اله الا اللّٰه کہیے، میں اس کلمہ سے اللہ کے نزدیک آپ کے حق میں حجت پکڑوں گا۔

مگر وہ نہیں مانے اور آخر میں یہ کہا کہ میں عبد المطلب کے دین پر ہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْکَ۔''

ترجمہ: جب تک مجھے منع نہ کیا جائے میں آپ کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْ ۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ.﴾ (سورۃ التوبۃ:۱۱۳)

ترجمہ: نبی کے لیے اور مؤمن لوگوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ مشرکین کے حق میں استغفار کریں اگر چہ کہ وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ

ہوں، جب کہ ان کے سامنے یہ بات آشکارا ہو چکی ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔
اور یہ آیت بھی نازل ہوئی:

﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ.﴾ (سورۃ القصص:۵۶)

ترجمہ: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے؛ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔(۱)

روایات میں ہے کہ جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کے حق میں استغفار کرنا چاہا تو آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، آپ نے عرض کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے حق میں دعا کی تھی، تو آپ پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ.﴾ (سورۃ التوبۃ:۱۱۴)

ترجمہ: اور حضرت ابراہیم کا اپنے باپ کے حق میں استغفار صرف ایک مدت تک کے لیے تھا، جس کا انھوں نے اس سے وعدہ کیا تھا؛ لیکن جب انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے تو انھوں نے اس سے براءت ظاہر کی، بلا شبہ ابراہیم تو بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔(۲)

ایک روایت میں یہ ہے کہ جب حضرات صحابہ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے آباء میں سے ایسے لوگ بھی تھے، جو بہت اچھا سلوک کرنے والے، رشتہ داری کا لحاظ کرنے والے، قیدیوں کو رہائی دینے

(۱) بخاري: ۳۸۸۴، مسلم ۱۴۱، نسائي: ۲۰۳۵، سنن کبری نسائي ۲۱۷۳، أحمد ۲۳۷۴۴، مستدرک حاکم: ۳۲۹۱

(۲) تفسیر ابن کثیر ۴/۲۲۳

والے اور حقوق کو پورا کرنے والے تھے، کیا ہم ان کے حق میں استغفار کر سکتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: کیوں نہیں! خدا کی قسم! میں بھی اپنے باپ کے حق میں استغفار کرتا ہوں جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے استغفار کیا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (۱)

الغرض کفار کے حق میں ایصال ثواب نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ ایمان کے بغیر کوئی چیز کام نہیں آتی اور کسی کا ایمان کسی اور کے حق میں نافع نہیں۔

اب رہی دیگر عبادات: جیسے بدنی عبادات، نماز، روزہ، ذکر و تلاوت، وغیرہ اور مالی عبادات، صدقہ و خیرات، وقف وغیرہ اور دونوں سے مرکب عبادات جیسے حج اور عمرہ، تو ان میں سے بعض کے بارے میں ائمہ کے درمیان کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، جس کی تفصیل اِن شاء اللہ آگے چل کر ہم پیش کریں گے، تاہم متعدد دلائل سے ان سب کے ذریعے ایصالِ ثواب کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لہذا ہم یہاں اب ایصالِ ثواب کی ان تمام صورتوں پر الگ الگ فصل میں کلام کریں گے اور ہر صورت کے دلائل بھی ساتھ ساتھ پیش کرتے جائیں گے؛ نیز اسی کے ساتھ حضرات ائمہ کرام کے مسالک بھی ہر صورت کے بارے میں پیش کریں گے، تاکہ علی وجہ البصیرۃ ہمارے سامنے مسئلہ واضح ہو جائے۔

سلف کے اجماع و اختلاف کا درجہ

چوتھی بات یہ ہے کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے اور آگے چل کر اس کی مزید وضاحت ہوگی کہ ایصالِ ثواب کی بعض صورتیں وہ ہیں جن کی مشروعیت پر اجماعِ امت پایا جاتا ہے اور سوائے بعض گمراہ فرقوں کے کوئی اس سے اختلاف نہیں کرتا اور بعض صورتوں میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۴/۲۲۴

یہاں اس تمہید میں اس سلسلے میں ایک اہم بات عرض کرنا ہے، وہ یہ کہ اگر کسی مسئلے میں سلف کا اجماع ہو تو اس کے حق ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے؟ اسی لیے حضرات علما نے اجماع کو حجت قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت کو گمراہی ٹھیرایا ہے۔

اور اگر سلف کے درمیان کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو ان میں سے جو بھی صورت اقرب الی الکتاب والسنۃ ہو اس کو اختیار کر لینا افضل ہے اور اگر کوئی اس قدر صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے، تو اس کو گنجائش ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی قول کو اختیار کر لے۔

لہٰذا ایصالِ ثواب کے مسئلے میں جو اجماعی صورتیں ہیں اور ان کا ذکر آگے چل کر کیا گیا ہے، ان کو تو بہ ہر حال اختیار کرنا چاہیے اور اس سے اختلاف کسی بھی طور روا نہیں ہے اور جن صورتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں ہم کسی بھی صورت کو اختیار کریں، اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ سلف کا کسی مسئلے میں اختلاف کرتے ہوئے دو یا زائد رایوں پر قائم ہو جانا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس مسئلے میں ان آراء میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کی گنجائش ہے، جب تک کسی ایک شق کے غلط ہونے پر کوئی قطعی اور مضبوط دلیل قائم نہ ہو اس وقت تک اس کو رد کرنا، یا اس کی تغلیط کرنا ناروا جسارت ہی کہی جا سکتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سلف کے اقوال میں سے کسی ایک کی تردید و تغلیط کے لیے کوئی قطعی دلیل یہاں نہیں مل سکتی الا ما شاء اللہ؛ لہٰذا جو لوگ عبادات بدنیہ اور بالخصوص قرآن کریم کی تلاوت سے ایصال ثواب کو مطلقاً بدعت قرار دیتے ہیں، یہ حدود سے تجاوز ہے اور اس سے بڑھ کر غلو یہ ہے کہ ایصال ثواب کی اجماعی صورتوں کو بھی ناجائز قرار دیا جائے۔

لہٰذا اجماعی مسائل میں اجماع کے ساتھ جڑ جانا اور سلف کے مابین اختلافی مسائل میں حدود سے تجاوز نہ کرتے ہوئے تمام آراء کا احترام کرنا اور جو لوگ دوسری رائے پر عمل کرتے ہیں ان کو اس کی گنجائش دینا ایک شرعی و عقلی اصول و طریقہ ہونے کے ساتھ سلف کا یہی طرز عمل رہا ہے اور ہمیں بھی اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔

بابِ اول

ایصالِ ثواب کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام
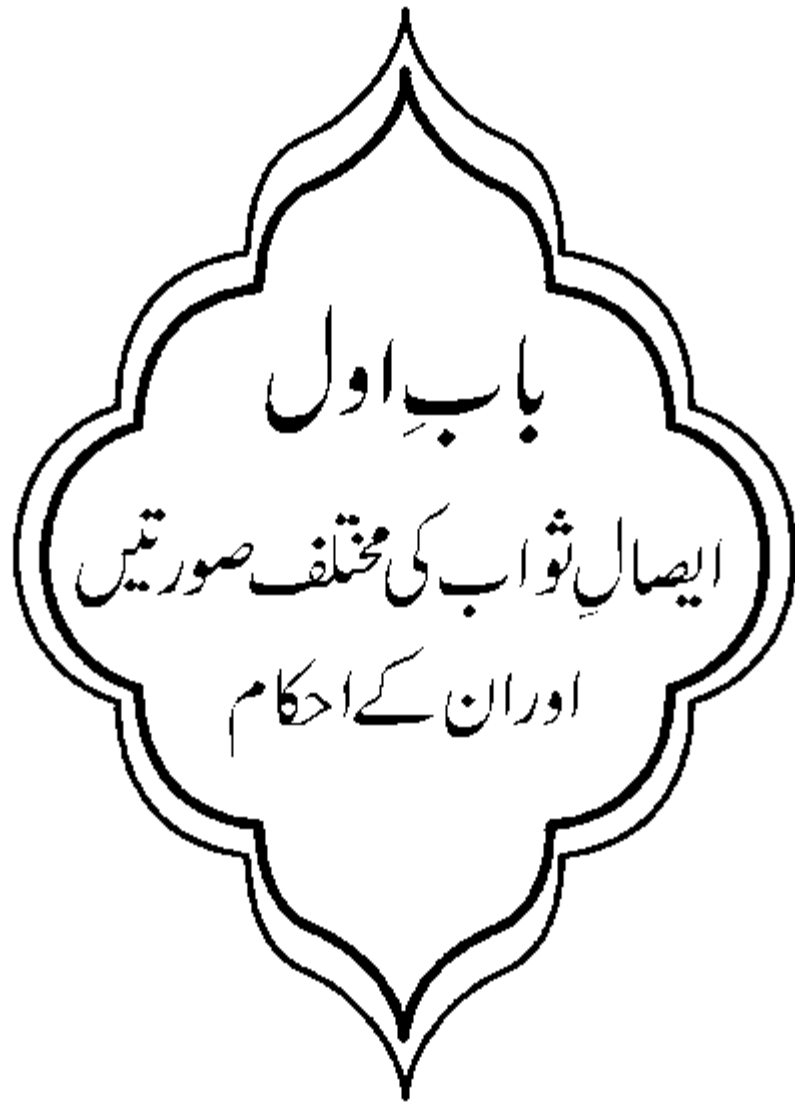
اب ہم اصل مقصود کی طرف آتے ہیں، پہلے باب میں ایصالِ ثواب کی مختلف صورتوں میں سے ہر صورت کو ایک فصل میں بیان کریں گے اور اس کی دلیل اور اس کے بارے میں مسالک ائمہ کا ذکر کریں گے۔

فصل اول

اپنی حیات میں جاری کی ہوئی طاعات کا ثواب بعد مرگ

ایک مؤمن اپنی حیات میں ایسی نیکیاں وطاعات جاری کردے، جن کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد بھی قائم وجاری رہے، تو ان کا ثواب اس شخص کے انتقال کے بعد اس کو پہنچتا ہے اور وصول ثواب کی اس صورت پر سبھی علما وائمہ کا اتفاق ہے۔

مذکورہ صورت سے وصول ثواب پر اجماع ہے

اس مسئلے میں اہل سنت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے؛ بل کہ اس پر اجماع ہے۔ چناں چہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''کتاب الروح'' میں لکھا ہے: اموات، زندوں کے دو عملوں سے بالاجماع منتفع ہوتی ہیں: ایک وہ عمل جس کا مرنے والا شخص اپنی زندگی میں سبب وذریعہ بنا ہو۔ دوسرے مسلمانوں کی ان کے حق میں دعا واستغفار، صدقہ اور حج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''والجواب أنها تنتفع من سعي الأحياء بأمرين مجمع عليهما بين أهل السنة من الفقهاء وأهل الحديث والتفسير: أحدهما : ما تسبب إليه الميت في حياته ، والثاني : دعاء

المسلمين له واستغفارهم له والصدقة والحج على نزاع ما الذي يصل من ثوابه هل ثواب الإنفاق أو ثواب العمل فعند الجمهور يصل ثواب العمل نفسه وعند بعض الحنفية إنما يصل ثواب الإنفاق. "

ترجمہ: مرحوم، زندوں کے عمل سے نفع پاتے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زندہ لوگوں کے عمل ومحنت سے مردگان کو دو ایسی باتوں سے فائدہ پہنچتا ہے جن پر اہل سنت والجماعۃ کے فقہاء ومحدثین ومفسرین کا اجماع ہے، ایک وہ عمل جس کا سبب وذریعہ مرنے والا بنا ہو۔ دوسرے مسلمانوں کی اس کے حق میں دعا واستغفار اور صدقہ وحج، اس اختلاف کے ساتھ کہ حج کا جو ثواب مرحوم کو ملتا ہے وہ حج کے اخراجات کا ملتا ہے یا عمل کا ملتا ہے، جمہور کے نزدیک بذات خود عمل کا ثواب ملتا ہے اور بعض حنفیہ کے نزدیک خرچ کا ثواب ملتا ہے۔(۱)

الغرض کوئی شخص اپنی حیات میں کسی نیک کام کا کوئی ذریعہ ووسیلہ بنا ہو تو اس کا ثواب اسے بعدِ موت بھی ملتا رہتا ہے۔

پہلی دلیل

اس کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ. »

ترجمہ: جب انسان مرجاتا ہے، تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے؛ مگر تین

(۱) كتاب الروح بتحقيق بسام علي سلامة العموش: ۴۳۵

اعمال کا ثواب جاری رہتا ہے: ایک صدقہ جاریہ کا، دوسرے نفع پہنچانے والے علم کا اور تیسرے نیک صالح اولاد کا جو اس کے حق میں دعا کرے۔(۱)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا ثواب مرنے کے بعد منقطع ہو جاتا ہے؛ مگر تین اعمال کا ثواب جاری رہتا ہے اور جن تین اعمال کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا ثواب منقطع نہ ہوگا، ان میں سے ہر ایک عمل وہ ہے جس کا ذریعہ و وسیلہ مرنے والا اپنی زندگی میں بنا تھا، اسی لیے ان کا ثواب بھی مرنے کے بعد جاری رہتا ہے۔

علامہ قاضی عیاض اور علامہ نووی، علامہ مناوی وغیرہ نے اس کی یہی وجہ بیان کی ہے۔(۲)

اور جو تین اعمال یہاں بیان فرمائے گئے ہیں، ان کی مختصر تشریح یہ ہے:

❁ صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ: صدقہ جاریہ وہ ہے، جس کو اس نے اپنی زندگی میں جاری کیا تھا، اور وہ صدقہ اس کی موت کے بعد بھی جاری رہے جیسے کنواں کھدوانا، مسجد بنانا، شفاخانہ بنانا، مدرسہ بنانا، وغیرہ، لہٰذا ان سب کاموں کا ثواب اس کو برابر ملتا رہے گا، جب تک اس کا جاری کردہ سلسلہ جاری رہے گا۔

❁ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ: وہ علم جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا رہے، جیسے کسی کو قرآن پڑھا دیا، یا دین کی تعلیم دے دی، یا کسی کو قرآن کریم کا نسخہ یا کوئی کتاب دیدی، یا کوئی تالیف وتصنیف کر گیا، جس سے لوگ نفع پاتے رہیں۔

❁ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ: نیک اولاد جو مرحوم ماں باپ کے حق میں دعا کرتی رہے، اس کا ثواب بھی مرحوم والدین کو پہنچتا رہتا ہے؛ بل کہ علما نے لکھا ہے

---

(۱) مسلم :۴۳۱۰، ترمذي:۱۳۷۶، أبو داود:۲۸۸۲، نسائي :۳۶۵۱،أحمد :۸۸۳۱، صحيح ابن خزيمة :۲۴۹۴،صحيح ابن حبان :۳۰۱۶

(۲) دیکھو : إكمال المعلم:۵/۳۷۳،شرح مسلم:۱۲/۱، فيض القدير :۱/۵۶۱

کہ کسی نے نیک اولاد چھوڑی تو اس کی نیکیوں کا ثواب بھی والدین کے حصہ میں لکھا جاتا رہے گا؛ کیوں کہ والدین اس کے نیک بننے میں وسیلہ وذریعہ بنے ہیں۔

دوسری دلیل

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْمًا نَشَرَهُ، وَ وَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ ، وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ ، أَوْ بَيْتًا لابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ ، أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ ، أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ ، تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ .»

ترجمہ: بلاشبہ مؤمن کو اس کی موت کے بعد اس کے جن اعمال کا ثواب ملتا ہے وہ یہ ہیں: وہ علم جس کی اس نے نشر واشاعت کی، نیک اولاد جو چھوڑ گیا، قرآن کریم کا نسخہ جو میراث میں چھوڑا ہو، مسجد بنائی ہو، مسافر خانہ بنایا ہو، نہر کھدوایا ہو، صدقہ جو اپنے مال میں سے اپنی زندگی اور صحت کے زمانے میں دیا ہو، ان سب کا ثواب اس کو ملتا ہے۔ (۱)

امام عبد العظیم المنذری محدث رحمہ اللہ نے کہا کہ: ابن ماجہ کی سند حسن ہے۔ (۲)

تیسری دلیل

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَرْبَعَةٌ تَجْرِي عَلَيْهِمْ أُجُورُهُمْ بَعْدَ الْمَوْتِ :مُرَابِطٌ فِي

(۱) ابن ماجه :۲۴۲، ابن خزيمة :۲۴۹۰، شعب الإيمان :۳۱۷۴

(۲) الترغيب والترهيب:۲۲۳

سَبِیلِ اللهِ ، وَمَنْ عَمِلَ عَمَلاً أُجْرِيَ لَهُ مِثْلُ مَا عَمِلَ ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَجْرُهَا لَهُ مَا جَرَتْ ، وَ رَجُلٌ تَرَکَ وَلَدًا صَالِحًا فَهُوَ يَدْعُو لَهُ.»

ترجمہ: چار شخص ہیں جن کا اجر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ایک اللہ کے راستے میں نگرانی کرنے والا، دوسرا وہ شخص جو کوئی نیک عمل کرے اس کا اجر اس کے عمل کے برابر جاری رہے گا، تیسرے وہ شخص جس نے صدقہ دیا، اس کا اجر اس وقت تک رہے گا جب تک وہ جاری و باقی رہے اور چوتھے وہ شخص جس نے نیک اولاد چھوڑی ہو اور وہ اس کے حق میں دعا کرتی رہے۔(۱)

یہی حدیث معجم طبرانی اور مسند الرویانی میں ذرا فرق کے ساتھ آئی ہے، اس میں ہے:

« مَنْ مَاتَ مُرَابِطًا فِي سَبِيلِ اللهِ ، وَمَنْ عَلِمَ عِلْمًا أُجْرِيَ لَهُ أَجْرُهُ مَا عَمِلَ بِهِ. »

ترجمہ: جو شخص اللہ کے راستے میں اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہوا انتقال کر جائے اور وہ شخص جو علم سیکھے اسے اس علم پر جب تک عمل ہو اجر جاری رہے گا۔(۲)

اس حدیث میں ''نیک عمل پر بعد موت اجر جاری رہنے'' سے مراد بظاہر یہ ہے کہ جو کوئی عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کی اقتداء کرتے ہوئے اس عمل کو اختیار کریں تو اس کو ان سب کے عمل کا ثواب ملے گا۔ واللہ اعلم

اور دوسری روایت میں عمل کے بجائے ''علم سیکھنے پر اجر جاری رہنے'' کا مطلب یہ

(۱) مسند أحمد: ۲۲۳۰، علامہ شعیب ارناؤوط نے مسند کی تعلیق میں اس کی سند کو ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے؛ مگر حدیث کو دیگر روایات کی وجہ سے صحیح کہا ہے۔

(۲) معجم طبرانی: ۷۴۷۷، مسند الرویانی: ۱۲۳۷

ہے کہ جو علم سیکھ کر دوسروں کو سکھائے، تو جو لوگ اس علم پر بعد میں عمل کرتے رہیں گے اس کا اجر بھی اس شخص کو بعد مرگ ملتا رہے گا۔(۱)

چوتھی دلیل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سَبْعٌ يَجرِيُ لِلعَبدِ أجْرُهُنَّ مِن بَعْدِ مَوتِه ، وهُوَ في قَبرِه.مَنْ عَلَّمَ عِلْماً، أو كَرىٰ نَهراً، أوْ حَفَرَ بِئراً، أوْ غَرَسَ نَخْلاً، أوْ بَنىٰ مَسْجِدًا، أوْ وَرَّثَ مُصْحفًا، أوْ تَرَكَ وَلَداً يَسْتَغْفِرُ لَه بَعْدَ مَوْتِه. »

ترجمہ: سات چیزیں ایسی ہیں، جس کا اجر بندے کو بعد موت بھی جاری رہتا ہے، جب کہ وہ قبر میں ہوتا ہے: جو علم سکھائے، یا نہر میں نیا گڑھا کھودے یا کنواں کھدوائے یا درخت کھجور لگائے یا مسجد بنائے یا قرآن کا نسخہ چھوڑ جائے یا نیک اولاد چھوڑے، جو اس کے لیے بعد موت استغفار کرتی رہے۔(۲)

یہ حدیث ضعیف ہے؛ کیوں کہ اس کی سند میں محمد بن عبید اللہ العرزمی متروک راوی ہے؛ مگر کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ اوپر کی احادیث کی تائید میں بہ طور شاہد اس کو پیش کیا گیا ہے اور شواہدات میں ضعیف چل جاتی ہے۔

ان احادیث سے علمائے کرام وفقہائے عظام نے استدلال کیا ہے کہ جن نیک اعمال کا وسیلہ وذریعہ کوئی شخص اپنی زندگی میں بنا، ان کا ثواب مرنے کے بعد ملتا رہے گا۔

---

(۱) قاله المناوي في التيسير شرح الجامع الصغير :۱/۴۷۹، وفي فيض القدير : ۱/۴۷۱

(۲) مسند بزار:۷۲۸۹، شعب الإيمان:۳۱۷۵، حلية الأولياء:۲/۳۴۴

دو علمی افادات

۱- ان احادیث شریفہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ پہلی حدیث میں مرنے کے بعد صرف تین باتوں کے اجر کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ بعد کی احادیث میں اور بھی متعدد امور کا اجر بعد مرگ جاری رہنے کا ذکر آیا ہے، جیسے ایک حدیث میں چار کا اور ایک اور حدیث میں سات کا ذکر ہے۔

مگر ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر معلوم ہو رہا ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ امام بیہقی نے فرمایا کہ تین اعمال والی حدیث میں جو صدقہ جاریہ کا ذکر ہے دوسری احادیث میں اسی صدقے کی دیگر صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔(۱)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان حادیث میں اصل مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ آدمی اگر اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام جاری کر جاتا ہے جس کا فائدہ بعد میں بھی جاری رہتا ہو، تو وہ کوئی بھی عمل ہو اس کا ثواب اس کی موت کے بعد جاری رہتا ہے، یا یہ کہ جو بھی اپنی حیات میں کسی نیکی کا سبب بن گیا ہو اس کو اس نیکی کا ثواب بعد مرگ بھی ملے گا؛ لہذا جس میں تین اعمال کا ذکر ہے وہ تین بھی اور دوسرے چار و سات اعمال بھی اسی قبیل کے ہیں، کسی حدیث میں تین کا کسی میں زائد کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

۲- علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الدیباج شرح مسلم میں لکھا ہے کہ ان احادیث سے کل گیارہ امور معلوم ہوتے ہیں جن کا ثواب بعد مرگ جاری رہتا ہے اور فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو نظم کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ لَيْسَ يَجْرِي عَلَيْهِ مِنْ فِعَالٍ غَيْرَ عَشْرِ
عُلُوْمٌ بَثَّهَا، وَ دُعَاءُ نَجْلٍ وَغَرْسُ النَّخْلِ وَالصَّدَقَاتُ تَجْرِيْ
وِرَاثَةُ مُصْحَفٍ وَ رِبَاطُ ثَغْرٍ وَ حَفْرُ الْبِئْرِ أَوْ إِجْرَاءُ نَهْرٍ
وَ بَيْتٌ لِلْغَرِيْبِ بَنَاهُ يَأْوِيْ إِلَيْهِ أَوْ بِنَاءُ مَحَلِّ ذِكْرٍ
وَ تَعْلِيْمٌ لِقُرْآنٍ كَرِيْمٍ فَخُذْهَا مِنْ أَحَادِيْثَ بِحَصْرٍ

(۱) فیض القدیر: ۴/۸۸

ترجمہ:

۱- جب ابن آدم مرجاتا ہے، تو اس کے اعمال میں سے دس کے سوا کسی عمل کا ثواب اس کے حق میں جاری نہیں ہوتا۔

۲- ایک وہ علوم جن کو پھیلایا، دوسرے اولاد کی دعاء، تیسرے درخت لگانا اور چوتھے صدقات کا ثواب جاری رہتا ہے۔

۳- پانچویں قرآن کا وراثت میں چھوڑ جانا، چھٹے سرحد کی پاسبانی، ساتویں کنواں کھدوانا، آٹھویں نہر جاری کرنا۔

۴- نویں مسافر خانہ جس کو بنایا ہو کہ مسافر وہاں ٹھکانا کرے، دسویں عبادت خانے کی تعمیر۔

۵- اور گیارھویں قرآن کریم کی تعلیم، پس ان کو احادیث سے اس گیارہ کے حصر کے ساتھ حاصل کرلے۔(۱)

(۱) الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج: ۴/ ۲۲۷

فصل ثانی

عباداتِ مالیہ سے ایصالِ ثواب

ایصالِ ثواب کی دوسری صورت عباداتِ مالیہ جیسے صدقہ وخیرات، قربانی، وغیرہ کے ذریعے ایصالِ ثواب ہے۔

مالی عبادات سے ایصالِ ثواب پر اجماع

مالی عبادات سے ایصالِ ثواب کی مشروعیت پر تمام ائمہ اہل سنت کا اجماع ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ عباداتِ مالیہ کا ثواب مرحومین کو پہنچانا جائز ہے اور اس سے ان کو ثواب پہنچتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ لکھتے ہیں۔

" فَلَا نِزَاعَ بَيْنَ عُلَمَاءِ السُّنَّةِ وَ الْجَمَاعَةِ فِي وُصُولِ ثَوَابِ الْعِبَادَاتِ الْمَالِيَّةِ كَالصَّدَقَةِ وَ الْعِتْقِ كَمَا يَصِلُ إِلَيْهِ أَيْضًا الدُّعَاءُ وَ الِاسْتِغْفَارُ وَ الصَّلَاةُ عَلَيْهِ صَلَاةَ الْجَنَازَةِ وَ الدُّعَاءُ عِنْدَ قَبْرِهِ. "

ترجمہ: اہل سنت والجماعت کے مابین اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عباداتِ مالیہ کا ثواب مرحومین کو پہنچتا ہے، جس طرح کہ دعا، استغفار اور جنازے کی نماز کا اور قبر کے پاس دعا کا ثواب پہنچتا ہے۔(۱)

امام مسلم نے حضرت امام ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

---

(۱) مجموع الفتاوی لابن تیمیة :۲۴/۳۶۶

"ليس في الصدقة اختلاف."

ترجمہ: صدقہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔(۱)

اسی طرح علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے "کتاب الروح" میں اور علامہ نووی رحمۃ اللہ نے "شرح مسلم" میں اس پر اجماع نقل کیا ہے۔(۲)

عباداتِ مالیہ سے ایصالِ ثواب کے دلائل

اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہیں، جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ وخیرات، اسی طرح کوئی اور مالی عبادت میت کی جانب سے کی جاسکتی ہے اور اس کا ثواب اس کو پہنچتا ہے۔

پہلی دلیل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

"حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوا جب کہ حضرت سعد موجود نہیں تھے، وہ اللہ کے رسول علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور عرض کیا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ أُمِّي تُوُفِّيَتْ وَأَنَا غَائِبٌ عَنْهَا أَيَنْفَعُهَا شَيْءٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَنْهَا.»

ترجمہ: یا رسول اللہ! میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا کہ میں موجود نہیں تھا، کیا اگر میں ان کی جانب سے صدقہ کروں تو ان کو کچھ نفع ہوگا؟۔

آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میرا ایک باغ ہے، میں اس کو ان کی جانب سے صدقہ کرتا ہوں۔(۳)

---

(۱) مسلم: ۱/ ۱۲

(۲) دیکھو: كتاب الروح بتحقيق بسام علي سلامة العموش: ۴۳۵ ،وشرح مسلم :۱/۱۲

(۳) بخاري: ۲۷۵۶، أبو داود: ۲۸۸۴، أحمد: ۳۰۸۰

دوسری دلیل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللهِ ! إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَ لَمْ تُوصِ وَأَظُنُّهَا لَو تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ ،أَفَلَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا ؟ قَالَ : نَعَمْ »

ترجمہ: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا اور اس نے کوئی وصیت نہیں کی، اگر وہ کچھ کہہ پاتی تو صدقہ کرتی، کیا اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں تو اس کو اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔(۱)

تیسری دلیل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: إِنَّ أَبِي مَاتَ وَتَرَكَ مَالاً وَلَمْ يُوصِ فَهَلْ يُكَفِّرُ عَنْهُ أَنْ أَتَصَدَّقَ عَنْهُ ؟ قَالَ: نَعَمْ. »

ترجمہ: ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا اور انھوں نے مال چھوڑا ہے؛ مگر کوئی وصیت نہیں کی، تو کیا اگر میں ان کی جانب سے صدقہ کروں تو ان کے حق میں یہ کفارہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔(۲)

ان روایات حدیثیہ سے معلوم ہوا کہ مرحومین کی جانب سے مالی عبادتصدقہ وخیرات

---

(۱) مسلم:۴۳۰۸

(۲) مسلم:۴۳۰۶،نسائي:۳۶۵۲،أحمد:۸۸۲۸،مسند بزار:۸۳۰۵، مسند أبي يعلى:۶۴۹۴ ، سنن بيهقي:۱۳۰۱۰

انجام دی جا سکتی ہے اور اس کا ثواب مرحومین کو پہنچتا ہے۔

قربانی سے ایصالِ ثواب

صدقے ہی کی ایک قسم قربانی بھی ہے اور اس کا ثبوت بھی احادیث سے ہوتا ہے، اگر چہ کہ اوپر کی احادیث کے بعد الگ سے اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم مزید افادے کی غرض سے اس کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلی دلیل

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« ذَبَحَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مُوجَأَيْنِ ، فَلَمَّا وَجَّهَهُمَا قَالَ :إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ عَلَى مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ، لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ ، وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَأُمَّتِهِ ، بِاسْمِ اللهِ وَاللهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ ذَبَحَ. »

ترجمہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن دو بڑی سینگوں والے کالے و سفید ملے جلے رنگ کے خصی کیے ہوئے مینڈھے ذبح کیے، جب ان کو قبلہ رخ کیا تو یہ دعا فرمائی:

«إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ عَلَى مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ، لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ. »

اور پھر فرمایا کہ اے اللہ! یہ (جانور) آپ ہی کا دیا ہوا آپ ہی کے لیے محمد اور ان کی امت کی جانب سے ہے، پھر بسم اللہ ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح فرمایا۔(۱)

حدیث مذکورہ کی سند پر کلام

اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہیں، جن کے بارے میں علمائے حدیث کی رائیں مختلف ہیں، اکثر حضرات ان کو قابل اعتبار قرار دیتے ہیں، البتہ یہ مدلس تھے اور مدلس راوی کی حدیث کا حکم یہ ہے کہ وہ اگر روایت میں سماع یا تحدیث کی صراحت کردے، تو قابلِ اعتبار ہو جاتی ہے اور یہاں ایسا ہی ہے کہ ابن اسحاق نے احمد کی روایت میں اپنے استاذ یزید بن ابی حبیب سے تحدیث کے صیغے سے روایت کی ہے؛ لہذا یہ قابل اعتبار ہوگی۔

معروف اہل حدیث عالم علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''مرعاۃ شرح مشکاۃ'' میں فرمایا:

''وفي إسناده عندهم محمد بن إسحاق، وقد صرح بالتحديث في روايته عن يزيد بن أبي حبيب عند أحمد ، وفيه أيضاً أبو عياش المعافري المصري، قال الحافظ في التقريب : مقبول.......... ، ولجابر حديث آخر رواه أبو يعلى ، قال الهيثمي بعد ذكره :إسناده حسن .

ترجمہ: اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں اور انھوں نے امام احمد کی روایت میں یزید بن ابی حبیب سے تحدیث کی تصریح کی ہے اور اس کی سند میں ایک راوی ابو عیاش معافری مصری بھی ہے، حافظ نے تقریب میں ان

(۱) ابو داود :۲۷۹۷، و اللفظ له، ابن ماجه:۳۱۲۱، احمد:۱۵۰۶۴،سنن بيهقي: ۱۹۶۵۷

کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مقبول ہے۔حضرت جابر سے ایک اور حدیث بھی منقول ہے، جس کو امام ابو یعلی نے روایت کیا ہے، امام ہیثمی نے اس کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔(۱)

دوسری دلیل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَمَرَ بِكَبْشٍ أَقْرَنَ يَطَأُ فِي سَوَادٍ ، وَيَبْرُكُ فِي سَوَادٍ ، وَ يَنْظُرُ فِي سَوَادٍ، فَأُتِيَ بِهِ لِيُضَحِّيَ بِهِ، فَقَالَ لَهَا: يَا عَائِشَةُ ! هَلُمِّي الْمُدْيَةَ: ثُمَّ قَالَ : اشْحَذِيهَا بِحَجَرٍ ، فَفَعَلَتْ، ثُمَّ أَخَذَهَا وَ أَخَذَ الْكَبْشَ، فَأَضْجَعَهُ، ثُمَّ ذَبَحَهُ ، ثُمَّ قَالَ :بِاسْمِ اللهِ اللَّهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ، ثُمَّ ضَحَّى بِهِ.»

ترجمہ :اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سینگوں والا مینڈھا لانے کا حکم دیا جس کے پیر کالے ہوں اور پیٹ اور سینہ کا حصہ بھی کالا ہو اور آنکھیں بھی کالی ہوں، چنانچہ وہ لایا گیا تا کہ آپ اس کی قربانی کریں۔آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے چھری دینا، پھر فرمایا کہ چھری کو پتھر پر تیز کرنا،وہ فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، پھر آپ نے چھری لی اور مینڈھے کو پکڑ کر پچھاڑا، پھر ذبح فرمایا، پھر کہا کہ اللہ کے نام سے، اے اللہ! یہ محمد اور محمد کی آل اور محمد کی امت کی جانب سے قبول فرما اور اس کی قربانی دی۔(۲)

---

(۱) مرعاة المفاتيح:۵/۸۳

(۲) مسلم:۵۲۰۳،أبو داود:۲۷۹۴،أحمد:۲۴۵۳۵، ابن حبان:۵۹۱۵،سنن بيهقي : ۱۹۵۱،مسند أبي عوانة :۷۷۹۱

تیسری دلیل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

« أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُضَحِّيَ، اشْتَرَى كَبْشَيْنِ عَظِيمَيْنِ، سَمِينَيْنِ، أَقْرَنَيْنِ، أَمْلَحَيْنِ مَوْجُوئَيْنِ ، فَذَبَحَ أَحَدَهُمَا عَنْ أُمَّتِهِ ، لِمَنْ شَهِدَ لِلّٰهِ بِالتَّوْحِيدِ ، وَشَهِدَ لَهُ بِالْبَلَاغِ ، وَذَبَحَ الْآخَرَ عَنْ مُحَمَّدٍ، وَعَنْ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. »

ترجمہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے، چت کبرے، خصی کئے ہوئے مینڈھے خریدتے اور ان میں سے ایک اپنی امت کے ان لوگوں کی جانب سے ذبح فرماتے جو توحید و رسالت کی گواہی دینے والے ہیں اور دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد کی جانب سے ذبح کرتے۔(۱)

یہ حدیث بہت سے صحابہ سے مروی ہے

یہ حدیث جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسے طرح اور صحابہ سے بھی آئی ہے۔ مشہور اہلِ حدیث عالم و محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

”وَهٰذَا الْحَدِيثُ أَخْرَجَهُ الْأَئِمَّةُ مِنْ حَدِيثِ جَمَاعَاتٍ مِنَ الصَّحَابَةِ عَائِشَةَ وَجَابِرٍ وَأَبِي طَلْحَةَ وَأَنَسٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ وَأَبِي رَافِعٍ وَحُذَيْفَةَ عِنْدَ مُسْلِمٍ وَالدَّارِمِيِّ وَأَبِي دَاوُدَ وَابْنِ مَاجَه وَأَحْمَدَ وَالْحَاكِمِ وَغَيْرِهِمْ.“

(۱) ابن ماجه:۳۱۲۲،أحمد:۲۵۹۲۸، طحاوي:۶۲۲۴

ترجمہ: اس حدیث کی ائمہ نے صحابہ کی جماعتوں: حضرت عائشہ، حضرت جابر، حضرت ابوطلحہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابورافع اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، جو مسلم، دارمی، احمد، حاکم وغیرہ حضرات محدثین کے پاس ہے۔(۱)

چوتھی دلیل

حضرت حنش کہتے ہیں:

« رَأَيْتُ عَلِيًّا يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ : مَا هَذَا ؟ فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَوْصَانِي أَنْ أُضَحِّيَ عَنْهُ فَأَنَا أُضَحِّي عَنْهُ. »

ترجمہ: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھے قربانی کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے پوچھا کہ یہ دو کیوں؟ انھوں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی تھی کہ میں آپ کی جانب سے بھی قربانی کروں، لہذا میں آپ کی جانب سے قربانی کرتا ہوں۔(۲)

حدیث مذکور کا درجہ

اس حدیث کے درجے کے بارے میں امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور امام ذہبی نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی ہے۔(۳)

نیز امام ابوبکر بن العربی مالکی نے ''عارضۃ الاحوذی'' شرح ترمذی میں اس کو صحیح کہا ہے۔(۴)

---

(۱) عون المعبود :۷/۴۸۷

(۲) أبو داود:۲۷۹۲، ترمذي:۱۴۹۵، أحمد :۸۴۳، أبو يعلي:۴۵۹، مستدرک حاکم:۷۵۵۶

(۳) مستدرک حاکم مع تلخيص الذهبي : ۴/ ۲۳۰

(۴) عارضة الأحوذي: ۶/ ۲۹۰

محقق احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ نے مسند احمد کی تعلیقات میں کہا کہ اس کی سند صحیح ہے اور حاکم نے بھی اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اور میرے نزدیک یہی راجح ہے۔(۱)

نوٹ: اس روایت کی مکمل تحقیق کا کسی کو ذوق ہو تو وہ ہمارے فتاوی کا انتظار کرے، اس میں ایک فتوی اس کی تحقیق میں لکھا ہے اور اس کے راویوں پر بھی مفصل کلام کیا گیا ہے۔

قربانی سے ایصالِ ثواب کے بارے میں علما کا کلام

ان احادیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مرحومین کی جانب سے قربانی کرنا جائز ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی جانب سے قربانی دی ہے؛ جب آپ نے یہ قربانی کی تھی تو امت میں سے بہت سے لوگ دنیا سے جا چکے تھے، آپ نے ان کی جانب سے قربانی دی؛ نیز بہت سے وہ بھی امتی تھے، جو بعد میں ہوئے اور ہوں گے، آپ نے ان کی جانب سے بھی قربانی دی۔

اہل حدیث کے معروف عالم محدث علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ نے ”تحفة الأحوذي شرح ترمذي“ میں اور دوسرے محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ نے ”عون المعبود شرح أبو داود“ میں اور تیسرے علامہ عبید اللہ مبارکپوری نے ”مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح“ میں کتاب ”غنية الألمعي“ کے حوالے سے لکھا ہے:

”قَوْل بَعْض أَهْل الْعِلْم الَّذِي رَخَّصَ فِي الْأُضْحِيَّة عَنْ الْأَمْوَات مُطَابِق لِلْأَدِلَّة ، وَقَوْل مَنْ مَنَعَهَا لَيْسَ فِيهِ حُجَّة فَلَا يُقْبَل كَلَامه إِلَّا بِدَلِيلٍ أَقْوَى مِنْهُ وَلَا دَلِيل عَلَيْهِ . وَالثَّابِت عَنْ النَّبِيّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ كَانَ يُضَحِّي عَنْ أُمَّته مِمَّنْ شَهِدَ لَه

(۱) مسند أحمد تحقيق أحمد شاكر: ۲/ ۵۳۲

بِالتَّوْحِيدِ ، وَشَهِدَ لَهُ بِالْبَلَاغِ وَعَنْ نَفْسه وَأَهْل بَيْته ، وَلَا يَخْفَى أَنَّ أُمَّته صلی اللہ علیہ وسلم مِمَّنْ شَهِدَ لَهُ بِالتَّوْحِيدِ وَشَهِدَ لَهُ بِالْبَلَاغِ كَانَ كَثِيرٌ مِنْهُمْ مَوْجُودًا زَمَنَ النَّبِيّ صلی اللہ علیہ وسلم ، وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ تُوُفُّوا فِي عَهْده صلی اللہ علیہ وسلم فَالْأَمْوَات وَالْأَحْيَاء كُلّهمْ مِنْ أُمَّته صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلُوا فِي أُضْحِيَّة النَّبِيّ صلی اللہ علیہ وسلم "

ترجمہ: بعض اہل علم کا قول جنھوں نے مرحومین کی جانب سے قربانی کو جائز کہا ہے دلیلوں کے مطابق ہے اور ان لوگوں کا قول جو اس سے منع کرتے ہیں، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے؛ لہذا اس سے بھی مضبوط دلیل کے بغیر ان کی بات قبول نہیں کی جاسکتی اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کے ان لوگوں کی جانب سے قربانی کی ہے جو اللہ کی وحدانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور آپ نے اپنی جانب سے اور اپنے گھر والوں کی جانب سے قربانی کی ہے۔ اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ آپ کی امت میں سے بہت سے تو آپ کے زمانے میں موجود تھے اور بہت سے ان میں سے وفات پا چکے تھے؛ لہذا زندے اور مردے سب آپ کی امت میں داخل اور آپ کی قربانی میں شامل ہیں۔ (۱)

الغرض یہ بات واضح و ثابت ہوئی کہ زندوں اور مردوں دونوں کی جانب سے قربانی کرنا درست و جائز ہے اور یہ کہ اس کا ثواب ان کو پہنچتا ہے، خود اللہ کے رسول صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے ایسا کیا ہے۔

---

(۱) تحفۃ الأحوذي: ۵/ ۷۹، عون المعبود: ۷/ ۴۸۷، مرعاۃ المفاتیح: ۵/ ۹۴

تیسری فصل

عبادات بدنیہ اور ایصال ثواب

رہیں عبادات بدنیہ جیسے دعا واستغفار، نماز وروزہ، ذکر وتلاوت وغیرہ تو ان میں سے بعض کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کا ثواب پہنچتا ہے اور بعض میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔

دعا واستغفار سے ایصالِ ثواب پر اجماع

عبادات بدنیہ میں سے ایصالِ ثواب کی جس صورت پر تمام اہل سنت کا اجماع ہے، وہ دعا واستغفار کے ذریعے ایصالِ ثواب ہے۔ چناں چہ تمام اہل سنت کہتے ہیں کہ زندہ لوگ اگر مردے کے حق میں دعا کریں یا استغفار کریں تو اس سے مرحوم کو نفع ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ صدقہ سے ایصالِ ثواب کا جواز بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

" وَكَذٰلِكَ يَنْفَعُهُ الْحَجُّ عَنْهُ وَالْأُضْحِيَّةُ عَنْهُ وَالْعِتْقُ عَنْهُ وَالدُّعَاءُ وَالِاسْتِغْفَارُ لَهُ بِلَا نِزَاعٍ بَيْنَ الْأَئِمَّةِ "

ترجمہ: اسی طرح میت کی جانب سے حج اور قربانی اور غلام کے آزاد کرنے اور اس کے حق میں دعا واستغفار کرنے سے اس کو باتفاق ائمہ نفع ہوتا ہے۔(۱)

(۱) مجموع الفتاوی: ۲۴/۳۱۵

شیخ الاسلام کے علاوہ متعدد علما نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، جن میں سے امام نووی، امام ابن القیم وغیرہ ہیں، ہم نے اوپر ایک جگہ علامہ ابن القیم کی عبارت اس سلسلے میں نقل کردی ہے۔

دعا و استغفار سے ایصال ثواب کے دلائل

اور دعا و استغفار سے مرحومین کو نفع و ثواب پہنچنا متعدد دلائل سے ثابت ہے، یہاں ان میں سے چند اہم دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی دلیل

ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

(سُوْرَةُ الْحَشْر: ۱۰)

ترجمہ: اور جو لوگ ان کے بعد آئے ان کا بھی حق ہے، وہ دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہماری اور ہم سے پہلے ایمان لانے والے ہمارے بھائیوں کی مغفرت فرمادیجیے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں سے بغض نہ پیدا فرمائیے، بلاشبہ آپ رحم و کرم والے ہیں۔

علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف اس بنا پر کی ہے کہ انھوں نے اپنے سے ماقبل مسلمانوں کے حق میں استغفار کیا؛ لہذا اس سے دلالت ہوئی کہ زندوں کے استغفار سے مرحومین کو نفع ہوتا ہے۔(۱)

(۱) کتاب الروح بتحقیق بسام علی سلامۃ العموش: ۴۳۹

دوسری دلیل

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لیے رحمت کی دعا کا حکم دیا ہے:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا.﴾

(سورۃ الاسراء:۲۴)

ترجمہ: اور والدین کے لیے نیازمندانہ اپنے عاجزی کے بازو جھکا دینا اور یہ دعا کرنا کہ اے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح کہ انھوں نے مجھے بچپن میں تربیت کی۔

اس آیت میں والدین کے حق میں دعا کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ حکم اسی لیے ہے کہ ان کے حق میں دعاء نافع ومفید ہے۔

تیسری دلیل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

«إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أَنّٰى لِيْ هٰذِهٖ؟ فَيَقُوْلُ: بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ.»

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیک بندے کے لیے جنت میں درجات بلند کردیں گے، وہ پوچھے گا کہ یہ درجات مجھے کہاں سے حاصل ہوئے؟ اس سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرے بیٹے کے تیرے حق میں استغفار سے۔(۱)

یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، علامہ سندھی نے حاشیہ ابن ماجہ میں زوائد سے نقل کیا کہ اس کی سند صحیح اور اس کے

(۱) ابن ماجه:۳۶۶۰، أحمد:۱۰۶۱۸، معجم كبير طبراني:۱۲۹۱، مصنف ابن أبي شيبة:۱۲۲۰۷

راوی ثقہ ہیں، علامہ المناوی نے فیض القدیر میں لکھا کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ نے اس کی سند کو قوی کہا ہے اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ نے کہا کہ بزار اور طبرانی نے اسے ایسی سند سے روایت کیا ہے، جس کے تمام رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں سوائے عاصم بن بہدلہ کے اور وہ حسن الحدیث ہیں۔(۱)

چوتھی دلیل

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مرحومین کی نماز جنازہ پڑھی ہے اور یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ نماز جنازہ فی الحقیقت دعاء ہی ہے اور اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ نماز جنازہ مرحومین کے حق میں نفع بخش ہے۔

پانچویں دلیل

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کچھ دیر ٹھہرتے اور لوگوں سے کہتے کہ

«اسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَسَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»

ترجمہ: اپنے اس بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے حق میں ثابت قدمی کا سوال کرو؛ کیوں کہ وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے۔(۲)

چھٹی دلیل

چھٹی دلیل یہ ہے کہ جب نجاشی شاہ حبشہ کا انتقال ہوا تو اللہ کے نبی علیہ السلام نے حضرات صحابہ سے فرمایا کہ

«اسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ»

---

(۱) دیکھو: تفسیر ابن کثیر:۷/۴۳۴، حاشية السندهي على ابن ماجه: ۳۶۵۰، فيض القدير:۲/۴۲۹

(۲) أبو داود:۳۲۲۳، شرح السنة:۵/۴۱۸

ترجمہ: اپنے بھائی کے حق میں استغفار کرو۔(۱)

مرحومین کے لیے اللہ کے نبی علیہ السلام کا دعا کرنا اور اس کی تعلیم دینا بے شمار احادیث سے ثابت ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

"ودعاء النبي علیہ السلام للأموات فعلاً وتعليماً، و دعاء الصحابة والتابعين و المسلمين عصراً بعد عصرٍ أكثر من أن يُذكر و أشهر من أن يُنكر."

ترجمہ: اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اموات کے حق میں دعا کرنا عملاً بھی اور تعلیماً بھی اور اسی طرح حضرات صحابہ اور تابعین اور اہلِ اسلام کا یکے بعد دیگرے ہر دور میں اموات کے لیے دعا کرنا اس کے ذکر کیے جانے سے زیادہ کثرت سے منقول اور انکار کیے جانے سے زیادہ مشہور ہے۔(۲)

یہ سارے دلائل اس بات کے لیے کافی ہیں کہ دعا و استغفار مرحومین کے لیے جائز ہے اور مفید بھی ہے۔

دعا سے ایصالِ ثواب کے بارے میں ایک حدیث کی تحقیق

اوپر کی تفصیل اور دلائل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعا اور استغفار سے ایصالِ ثواب کا مسئلہ ایک اجماعی مسئلہ ہے جس پر اجماع کے علاوہ بھی متعدد قرآنی و حدیثی دلائل موجود ہیں۔

---

(۱) بخاري:۱۳۲۷، مسلم:۲۲۴۸، نسائي:۱۸۷۹، صحيح ابن حبان:۳۱۰۱، مسند أبو يعلى:۵۹٦۸، سنن بيهقي:۱۸۲/۷

(۲) كتاب الروح بتحقيق بسام علي سلامة العموش:۴۴۲

البتہ یہاں اہلِ علم کے افادے کی خاطر ایک حدیث پر۔ جس کا تعلق بھی دعا کے ذریعے ایصالِ ثواب کرنے سے ہے۔علمی کلام مناسب معلوم ہوا،لہذا یہاں اس کو پیش کیا جاتا ہے ، وہ یہ کہ ایک حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

«مَا الْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْغَرِيقِ الْمُتَغَوِّثِ، يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ أَبٍ أَوْ أُمٍّ أَوْ أَخٍ أَوْ صَدِيقٍ، فَإِذَا لَحِقَتْهُ كَانَتْ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، وَإِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيُدْخِلُ عَلَى أَهْلِ الْقُبُورِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ، وَإِنَّ هَدِيَّةَ الْأَحْيَاءِ إِلَى الْأَمْوَاتِ الاسْتِغْفَارُ لَهُمْ. »

ترجمہ: میت تو قبر میں بس ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی غرق ہونے والا فریادی ہوتا ہے، جو اپنے ماں، باپ، بھائی یا دوست کی جانب سے ملنے والی دعا کے انتظار میں ہوتی ہے، جب اسے ان کی جانب سے دعا پہنچتی ہے تو وہ اس کے نزدیک دنیا و مافیھا سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور بلاشبہ اللہ تعالی زمین والوں کی دعا سے قبر والوں پر پہاڑوں برابر رحمتیں نازل کرتے ہیں اور بے شک زندوں کا تحفہ مردوں کے لیے ان کے حق میں استغفار ہے۔ (۱)

یہ حدیث عند التحقیق صحیح نہیں ہے؛ بل کہ منکر ہے؛ کیوں کہ اس کے ایک طریق میں فضل بن محمد بن عبد الحارث الانطا کی ہے اور مسند الفردوس کی سند میں حسن بن علی بن عبد الواحد ہے اور یہ دونوں راوی نا قابل اعتبار ہیں، جیسا کہ آگے عرض کروں گا۔

اس کے علاوہ اس حدیث پر مزید دو اشکال ہیں: ایک تو یہ کہ یہ روایت ابن المبارک کے غرائب میں سے ہے، کوئی اور ان کے ساتھ اس کو روایت نہیں کرتا۔ چناں چہ امام بیہقی

(۱) شعب الإيمان :۷۵۲۷،مسند الفردوس :۶۳۲۳، مشكاة المصابيح:۲۳۷۸، كنز العمال:۱۷،۴۲۹۷۴

نے امام ابوعلی الحافظ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ ابن المبارک کی حدیث سے یہ غریب ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے راویوں میں سے ایک راوی محمد بن جابر بن ابی عیاش المصیصی کے بارے میں امام ذہبی نے کہا کہ ''لا أعرفه'' کہ میں اس کو جانتا نہیں کہ کون ہے۔ لہٰذا یہ مجہول راوی ہے، اس لیے اس کی حدیث ناقابل اعتبار ہے، چناں چہ امام ذہبی نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔ اور ان تمام باتوں میں ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں ان کی موافقت کی ہے۔(۱)

راقم الحروف عرض پرداز ہے کہ جہاں تک ان دو اشکالات کا سوال ہے، ان کا جواب اگرچہ کہ ممکن ہے؛ مگر اس کے مذکورہ دو راویوں کا حال اس قدر برا ہے کہ ان کی وجہ سے اس کو منکر ہی قرار دینا پڑتا ہے۔

مثلاً پہلی بات کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ خود امام بیہقی نے حافظ ابوعلی کے مذکورہ قول کے بعد امام احمد سے نقل کیا کہ اس روایت کو محمد بن جابر سے روایت کرنے میں ابن المبارک کی محمد بن خزیمہ نے متابعت کی ہے، لہٰذا اس کی روایت میں محمد بن جابر متفرد ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس حدیث کی روایت میں امام ابن المبارک کو متفرد قرار دینا صحیح نہیں؛ بل کہ یہ تفرد محمد بن جابر کا ہے۔

لیکن احقر کہتا ہے کہ محمد بن جابر بن ابی عیاش بھی اس میں متفرد نہیں ہے، کیوں کہ مسند الفردوس میں اس کی متابعت ابو ہمام الولید بن شجاع نے کی ہے۔(۲)

لہٰذا اس حدیث کی روایت میں نہ ابن المبارک متفرد ہیں، نہ محمد بن جابر المصیصی؛ بل کہ دونوں کی متابعت موجود ہے۔

نوٹ: حاشیۂ مسند الفردوس میں علامہ ابن لال کی ''زهر الفردوس'' کے حوالے سے اس حدیث کی جو سند ذکر کی گئی ہے اس میں یہاں ''ابوتمام الولید بن شجاع''

(۱) دیکھو: میزان الاعتدال: ۶/ ۸۶، لسان المیزان: ۷/ ۴۴

(۲) دیکھو: حاشیة مسند الفردوس: ۴/ ۱۰۳

واقع ہوا ہے؛ مگر تلاش بسیار کے باوجود الولید بن شجاع نامی کوئی راوی جس کی کنیت ابوتمام ہو، کتب اسماء الرجال میں احقر کو نہیں ملا۔ احقر کا خیال ہے کہ غالباً یہ ''ابوھمام الولید بن شجاع'' ہے اور کسی کے وہم کے نتیجے میں ''ابوتمام الولید بن شجاع'' ہوگیا ہے؛ کیوں کہ الولید بن شجاع نامی اسی طبقے کے ایک راوی کی کنیت ابوھمام ہے اور یہ جمہور ائمۂ محدثین کے نزدیک ثقہ ولائق اعتماد ہیں، ان سے روایت کرنے والے حضرات میں امام مسلم، امام ابوداود، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ وغیرہ اکابرین بھی ہیں۔ اور امام احمد، امام عجلی، ابن معین وغیرہ ائمہ حدیث نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ہاں! بعض نے ان کو ضعیف بھی کہا ہے۔(۱)

رہی دوسری بات کہ اس کا راوی محمد بن جابر المصیصی مجہول ہے، تو اس کا جواب یہ ممکن ہے کہ مذکورہ راوی اگر چہ کہ مجہول ہو؛ مگر جب اس کی متابعت ابوتمام الولید نے کی ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اور یہ راوی جمہور کی رائے کے مطابق ثقہ ہے اور متابعات کی وجہ سے روایت کو قوت ملنا معروف ہے، پھر اس حدیث کا یہ مضمون دیگر احادیث سے مؤید بھی ہے، جیسا کہ ایک حدیث اوپر ابھی گزری، کہ اس میں بھی استغفار و دعا سے میت کے درجات کی بلندی کا ذکر ہے، لہذا یہ حدیث اوپر کی حدیث کی شاہد کہی جا سکتی ہے اور شواہدات سے بھی حدیث ضعف سے نکل جاتی اور قوت پا لیتی ہے۔

یہ تو ان اشکالات کا جواب تھا؛ مگر اس کی سند میں بحث یہ ہے کہ مسند الفردوس کی سند میں ایک راوی حسن بن علی بن عبد الواحد آیا ہے اور شعب الایمان کی سند میں فضل بن محمد بن عبد الحارث الانطا کی واقع ہے اور ان دونوں پر بھی کلام کیا گیا ہے۔

چناں چہ حسن بن علی کے بارے میں علامہ ذہبی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

''الحسن بن علي بن عبد الواحد عن هشام بن عمار بخبر باطل :رواه عنه مكي بن بندار. (حسن بن علی بن عبد الواحد نے ہشام

(۱) دیکھو: تہذیب الکمال: ۳۱/ ۲۵-۲۲

بن عمار سے باطل حدیث روایت کی ہے اور اس سے مکی بن بندار نے روایت کیا ہے۔"(۱)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے بھی یہی بات لکھی ہے اور نیز کہا:

" قال ابن ناصر : اتهم وروى حديثاً في الورد ، لا أصل له "(۲)

اور علامہ حلبی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

"الحسن بن علي بن عبد الواحد المقدسي ، عن هشام بن عمار ، وعنه مكي بن بندار ، ذكر له ابن الجوزي حديثاً في فضل الورد ، ثم قال : نتهم به المقدسي فإنه شيء ما رواه مالک ولا الزهري ولا أنس ، انتهى . وقال الحافظ الذهبي : عن هشام بن عمار بخبر باطل "(۳)

معلوم ہوا کہ یہ راوی حسن بن علی بن عبد الواحد محدثین کی نظر میں ضعیف؛ بل کہ متہم ہے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے راوی کی حدیث منکر ہوا کرتی ہے۔

اور دوسری سند کے راوی فضل بن محمد بن عبد اللہ بن الحارث الباہلی الانطا کی جو شعب الایمان کی روایت میں ہے، اس کے بارے میں ابن عدی نے لکھا ہے:

"یہ احادیث میں کمی وزیادتی کرتا ہے اور متون احادث کا سرقہ کرتا ہے، پھر اس کی چند منکر قسم کی احادیث کا ذکر کرنے کے بعد میں کہا کہ اس کی احادیث کی ثقات متابعت نہیں کرتے۔"(۴)

اور حافظ ابن حجر نے حمزہ بن یوسف کے حوالے سے لکھا ہے:

---

(۱) ميزان الاعتدال:۱/۵۰۵، المغني في الضعفاء:۱/۱۶۳

(۲) لسان الميزان:۳/۸۵

(۳) الكشف الحثيث:۱/۹۳

(۴) الكامل لابن عدي:۶/۱۸-۱۷

''انھوں نے کہا کہ میں نے ابن عدی اور دار قطنی وغیرہ سے سنا ہے کہ یہ کذاب ہے۔''(۱)

لہٰذا یہ راوی بھی کذاب اور جھوٹا ہے اور اس کی حدیث بھی ظاہر ہے کہ موضوع ہوگی ،لہٰذا یہ دونوں سندیں نا قابل اعتبار ہیں۔

عبادات بدنیہ کی دوسری صورتوں سے ایصال ثواب

اس کے بعد آیئے عبادات بدنیہ کی دوسری صورتوں کی طرف: جیسے نماز و روزہ اور ذکر و تلاوت سے ''ایصالِ ثواب'' پر نظر کریں گے، جن میں علما کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ فقہا نے عموماً ایصالِ ثواب کے مسئلے کو نیابت فی العبادات کے مسئلے کے تحت درج کیا ہے، اس سے اگر چہ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ایصال ثواب اور نیابت فی العبادات دونوں ایک ہی مسئلے کے دو عنوان ہیں، بات فی الواقع ایسی نہیں ہے، جیسا کہ ہم اس کو واضح کریں گے؛ لیکن چوں کہ فقہا نے اسے نیابت والے مسئلے کے تحت ذکر کیا ہے اس لیے ہم نیابت فی العبادات کے مسئلے کی وضاحت بھی یہاں کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

مسئلہ نیابت فی العبادات کی وضاحت

نیابت فی العبادات کے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص پر کوئی عبادت فرض و واجب تھی، خواہ وہ اللہ کی جانب سے واجب ہوئی ہو یا خود بندے نے نذر و منت مان کر اپنے ذمے واجب کر لی ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کی جانب سے نیابت کرتے ہوئے اس فرض و واجب کو ادا کرے، تو اس شخص کا وہ فرض و واجب اس کے ذمے سے ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟

---

(۱) لسان المیزان: ۶/۳۵۱

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ عبادات چار قسم کی ہیں، ان میں سے عبادات قلبیہ کے بارے میں گزر گیا کہ ان میں ایصالِ ثواب نہیں چلتا، ان کے علاوہ تین قسم کی عبادات ہیں:

- ایک مالی عبادت، جیسے صدقہ و زکاۃ و خیرات، کفارے میں کھانا کھلانا یا کپڑا دینا وغیرہ، اور اسی میں کسی نیک کام کے لیے زمین وقف کرنا، مدرسہ یا مسجد کی تعمیر، کنواں کھدوانا، شفاء خانہ بنانا بھی داخل ہے۔
- دوسرے بدنی عبادت، جیسے نماز، روزہ، اعتکاف، تلاوت وذکر ووظائف۔
- تیسرے وہ عبادت جو مالی و بدنی دونوں کی جامع ہو، جیسے حج۔

ان میں سے جہاں تک مالی عبادات کا تعلق ہے، اس میں سب حضرات اہل سنت کا اتفاق ہے کہ ان میں نیابت جاری ہوتی ہے، کہ اگر ایک شخص نے دوسرے کی نیابت کرتے ہوئے اس کی زکاۃ دے دی یا اس کا کوئی اور صدقہ دے دیا، یا قربانی کردی، تو یہ جائز و درست ہے اور اس کی جانب سے ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح جو عبادت ان دونوں سے مرکب ہو جیسے حج یا عمرہ تو اس میں جمہور علما کے نزدیک عذر دائمی کے وقت نیابت جائز ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

لیکن خالص بدنی عبادات میں نیابت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ کرام میں اختلاف ہے: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان میں نیابت جاری نہیں ہوتی؛ جب کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ان میں بھی نیابت جاری ہوتی ہے۔

مسئلہ نیابت اور مسالک ائمہ

یہاں مناسب ہے کہ اس سلسلے میں مذاہب ائمہ بیان کر دیے جائیں۔ علامہ ابن الشاط مالکی امام قرافی کی "الفروق" پر اپنے حاشیے میں فرماتے ہیں کہ

"وَذٰلِکَ أَنَّ الْأَعْمَالَ الْقَلْبِیَّةَ کَالْإِیمَانِ بِاللّٰہِ تَعَالٰی لَا

خِلَافَ فِي عَدَمِ صِحَّةِ النِّيَابَةِ فِيهَا إِلَّا مَا كَانَ مِنَ النِّيَّةِ كَإِحْجَاجِ الصَّبِيِّ وَسَائِرِ نِيَّاتِ الْأَعْمَالِ الَّتِي تَصِحُّ النِّيَابَةُ فِيهَا عَلَى حَسَبِ الْخِلَافِ فِي ذٰلِكَ أَيْضًا ، وَغَيْرَ الْقَلْبِيَّةِ إِنْ كَانَتْ مَالِيَّةً مَحْضَةً كَرَدِّ الْعَوَارِيِّ وَالْوَدَائِعِ وَالْغُصُوبَاتِ وَقَضَاءِ الدُّيُونِ وَتَفْرِيقِ الزَّكَوَاتِ وَالْكَفَّارَاتِ وَلُحُومِ الْهَدَايَا وَالضَّحَايَا وَذَبْحِ النُّسُكِ ، فَلَا خِلَافَ فِي صِحَّةِ النِّيَابَةِ فِيهَا ، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ مَالِيَّةٍ مَحْضَةٍ فَبَعْضُهُمْ حَكَى الْإِجْمَاعَ فِي عَدَمِ صِحَّتِهَا فِي الصَّلَاةِ ، وَالْخِلَافَ فِيمَا عَدَاهَا ، وَبَعْضُهُمْ حَكَى الْخِلَافَ فِي الصَّلَاةِ أَيْضًا "

ترجمہ: اس کا حاصل یہ ہے کہ قلبی اعمال جیسے اللہ پر ایمان ، اس میں نیابت صحیح نہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور ان کے علاوہ دوسرے اعمال اگر مالی عبادات ہیں جیسے عاریت، امانت اور غصب کردہ چیزوں کا لوٹانا، قرض کا ادا کرنا زکاۃ، کفارات، ھدی وقربانی کے گوشت کا تقسیم کرنا، اورقربانی کا جانور ذبح کرنا تو ان میں نیابت کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اگر عبادات محض غیر مالی (یعنی بدنی) ہوں تو بعض علما نے نماز کے بارے میں نیابت صحیح نہ ہونے پر اجماع اور دیگر عبادات کے بارے میں اختلاف نقل کیا ہے۔ اور بعض نے نماز کے بارے میں بھی اختلاف نقل کیا ہے۔ (۱)

احناف کا مسلک یہ ہے کہ عبادات مالیہ میں نیابت ہر صورت میں جائز و درست ہے، خواہ جس کی جانب سے مالی عبادت انجام دی جا رہی ہے اسے کوئی عذر ہو یا نہ ہو اور

(۱) ابن الشاط علی انوار البروق:۲/۳۶۲

عبادات بدنیہ میں کسی صورت میں بھی نیابت جائز نہیں اور مال و بدن دونوں سے انجام دی جانے والی عبادت جیسے حج وعمرہ، اس میں عذر دائمی کے وقت نیابت جائز ہے اور اگر عذر ہی نہ ہو یا عذر دائمی نہ ہو تو نیابت جائز نہیں۔(۱)

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک اس سلسلے میں کیا ہے؟ امام بدر الدین زرکشی رحمہ اللہ "البحر المحيط في أصول الفقه" میں آپ کا مسلک بیان کرتے ہوئے خود امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک عبارت ان کی کتاب "الام" سے نقل فرمائی ہے:

" وَلَوْ أَنَّ رَجُلًا صَامَ عن رَجُلٍ بِأَمْرِهِ لم يُجْزِهِ الصَّوْمُ عنه، وَذَلِكَ أَنَّهُ لا يَعْمَلُ أَحَدٌ عن أَحَدٍ عَمَلَ الْأَبْدَانِ ؛ لِأَنَّ الْأَبْدَانَ تَعَبَّدَتْ بِعَمَلٍ ، فَلا يُجْزِءُ عنها أَنْ يَعْمَلَ عنها غَيْرُهَا ليس الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ بِالْخَبَرِ الَّذِي جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَبِأَنَّ فِيهِمَا نَفَقَةً وَأَنَّ اللَّهَ فَرَضَهُمَا عَلَى مَنْ وَجَدَ إِلَيْهِمَا السَّبِيلَ ، وَالسَّبِيلُ بِالْمَالِ.

ترجمہ: اگر ایک شخص دوسرے کی جانب سے اس کے حکم پر روزہ رکھے تو یہ روزہ اس کی جانب سے کافی نہ ہوگا اور یہ اس وجہ سے کہ کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے بدنی عمل انجام نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ جسم و بدن کسی عمل کے ہی ذریعے عبادت کرتے ہیں، لہٰذا ان میں یہ کافی نہیں کہ کوئی اور ان کو انجام دے دے، سوائے حج وعمرے کے، اس حدیث کی بنا پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی ہے اور اس وجہ سے کہ ان (حج و عمرے) میں خرچ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں اُن کے حق میں

(۱) البحر الرائق:۳/۱۱۰،بدائع الصنائع:۲/۲۱۲، الدر المختار:۲/۵۹۵

مشروع کیے ہیں جوان کو ادا کرنے کی سبیل پائے اور سبیل تو مال ہے۔(۱)

امام مالک رحمۃ اللہ کے یہاں بھی نماز وروزہ وغیرہ عبادات بدنیہ میں نیابت جائز ودرست نہیں، جس کی تصریح متعدد مالکیہ حضرات نے کی ہے۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تین ائمہ کرام امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک عبادات بدنیہ میں نیابت نہیں ہوسکتی کہ کسی کی نماز یا روزہ وغیرہ عبادات میں کوئی دوسرا شخص اس کا نائب بن کر یہ امور ادا کرے۔

ہاں حنابلہ کے یہاں اس مسئلے میں روایات مختلف معلوم ہوتی ہیں، بعض حنابلہ کے نزدیک اس میں توسع ہے کہ مطلقاً بدنی عبادات میں بھی ایک شخص دوسرے کی جانب سے ان میں نائب ہوسکتا ہے اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جو نذر کی نماز وروزہ ہو اس میں نیابت جائز ہے اور فرض نماز وروزہ میں اس کی گنجائش نہیں؛ لیکن متعدد حنابلہ نے نقل یہ کیا ہے کہ نماز وروزہ وغیرہ عبادات بدنیہ میں مطلقاً نیابت جائز ہے۔

معروف حنبلی فقیہ امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ نے "الشرح الکبیر" میں دعا استغفار، روزہ وحج کے سلسلے میں وارد احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"وفيها دلالة على انتفاع الميت بسائر القرب ؛ لأن الصوم والحج والدعاء و الاستغفار كلها عبادات بدنية ، وقد أوصل الله نفعها إلى الميت ، فكذلك ما سواها مع ما ذكرنا من الحديث في ثواب من قرأ (يٰسٓ)وتخفيف الله عزوجل عن أهل المقابر بقراء ته ؛ و لأنه عمل بر و طاعة

(۱) البحر المحیط:۱/۳۴۸

(۲) الدسوقي علی الشرح الکبیر :۲/۱۸، الذخیرة للقرافي:۳/۱۹۴،بلغة السالک اقرب المسالک:۲/۱۰

فوصل نفعه و ثوابه كالصدقة و الصيام و الحج الواجب."

ترجمہ: ان احادیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ تمام عبادات سے میت منتفع ہوتی ہے؛ کیوں کہ روزہ، حج، دعاء، استغفار یہ سب بدنی عبادات ہیں اور ان کا نفع اللہ میت کو پہنچاتا ہے، اسی طرح ان کے علاوہ دیگر عبادات کا ثواب بھی پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ احادیث بھی ہیں، جو ہم نے سورہ یس پڑھنے کے ثواب اور اس کے پڑھنے سے قبر والوں کے عذاب میں اللہ تعالیٰ کے تخفیف کرنے کے بارے میں ذکر کیا ہے، نیز اس لیے بھی یہ درست ہے کہ یہ سب نیک اعمال اور طاعات ہیں، لہذا ان کا ثواب و نفع پہنچے گا جیسے کہ صدقے اور روزے اور حج واجب کا پہنچتا ہے۔(1)

امام مرداوی حنبلی نے "الانصاف" میں اس سلسلے میں کئی اقوال نقل کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

"و قال أبو الخطاب في الانتصار في جواب من قال: العبادة لا تدخلها النيابة، فقال: لا نسلم؛ بل النيابة تدخل الصلاة والصيام إذا وجبت وعجز عنها بعد الموت. و قال أيضاً فيه: فأما سائر العبادات فلنا رواية أن الوارث ينوب عنه في جميعها في الصوم والصلاة. انتهى. و مال الناظم إلى جواز صوم رمضان عنه بعد موته. فقال: لو قيل به أبعد. وقال في الفائق: ولو أخّره لا لعذر، فتوفي قبل رمضان آخر أطعم عنه لكل يوم مسكين. والمختار الصيام عنه، انتهى. و قال ابن عبدوس في تذكرته: و يصح قضاء نذر،

(1) الشرح الكبير لابن قدامة: ۲/۴۲۵

قلت: وفرض عن میت مطلقاً کاعتکاف".

ترجمہ: ابو الخطاب نے ان لوگوں کے جواب میں جو کہتے ہیں کہ عبادات میں نیابت نہیں چلتی یہ کہا کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے؛ بل کہ نیابت نماز و روزہ میں بعد موت چلتی ہے، جب کہ یہ کسی پر واجب ہو جائیں اور وہ ان کو ادا کرنے سے عاجز ہو گیا ہو، نیز یہ بھی کہا کہ رہی دوسری عبادات تو ہماری دلیل وہ روایت ہے جس میں ہے کہ وارث تمام عبادات نماز و روزہ سب میں میت کا نائب ہے۔ ناظم کتاب بھی اسی جانب مائل ہیں کہ رمضان کے روزے بعدِ موت میت کی جانب سے ادا کر سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ اگر یہ قول اختیار کیا جائے، تو کوئی بعید نہیں اور فائق میں لکھا کہ اگر روزہ کو بلا کسی عذر کے موخر کر دیا اور دوسرا رمضان آنے سے قبل انتقال کر گیا تو اس کی جانب سے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے اور مختار قول یہ ہے کہ اس کی جانب سے روزے رکھے جائیں۔ اور ابن عبدوس نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "نذر کی قضاء میت کی جانب سے صحیح ہے"، "میں کہتا ہوں کہ" میت کی جانب سے فرض نماز کی قضاء بھی مطلقاً درست ہے جیسے کہ اعتکاف درست ہے۔ (۱)

الغرض عباداتِ بدنیہ میں نیابت کے بارے میں تین ائمہ تو عدمِ جواز کے قائل ہیں، جب کہ امام احمد رحمۃ اللہ کے مسلک میں اس کی گنجائش ہے۔

عباداتِ بدنیہ میں نیابت درست کیوں نہیں؟

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ جو حضرات نیابت کے سلسلے میں عباداتِ بدنیہ و عباداتِ مالیہ میں فرق کرتے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔

---

(۱) الإنصاف:۳/۲۲۷

معروف مالکی فقیہ امام قرافی رحمۃ اللہ نے "الفروق" میں اس سلسلے میں جو کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

"افعال دو قسم کے ہیں: ایک وہ جن کی انجام دہی کسی مصلحت کی بنا پر ہو، اس سے قطع نظر کہ کون اس کو انجام دے رہا ہے، جیسے امانتوں کا لوٹانا، قرضوں کی ادائیگی، غصب کردہ چیزوں کو واپس کرنا، زکاۃ و کفارات اور قربانیوں کے گوشت کا تقسیم کرنا اور قربانی ذبح کرنا وغیرہ، اس قسم کے کاموں میں نیابت بالاتفاق صحیح ہے؛ کیوں کہ یہاں مقصود ان چیزوں سے لوگوں کو نفع پہنچانا ہے اور یہ بات نائب کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم وہ افعال جو فی نفسہ نہیں؛ بل کہ اس کے کرنے والے کے لحاظ سے مصلحت پر مشتمل ہیں۔ جیسے نماز کہ اس کی مصلحت خشوع و خضوع اور اللہ تعالی کی جلالت و بڑائی کا اظہار ہے۔ اور یہ چیز اس کے بجالانے والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی اور اس کو کرے گا تو شریعت کا مقصود ہی فوت ہو جائے گا جس کا شرع نے مطالبہ کیا ہے۔"(۱)

اسی کو امام سرخسی رحمۃ اللہ نے "المبسوط" میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

"وَالْحَاصِلُ أَنَّ الْعِبَادَاتِ الْمَالِيَّةَ الْمَقْصُودُ مِنْهَا صَرْفُ الْمَالِ إِلَى سَدِّ خَلَّةِ الْمُحْتَاجِ وَذٰلِکَ يَحْصُلُ نِيَابَةً فَيَجُوزُ الْإِنَابَةُ فِيهَا فِي حَالَةِ الِاخْتِيَارِ وَالضَّرُورَةِ ، وَالْعِبَادَاتُ الْبَدَنِيَّةُ الْمَحْضَةُ الْمَقْصُودُ مِنْهَا إِمَّا التَّعْظِيمُ بِالْجَوَارِحِ كَالصَّلَاةِ ، وَإِمَّا إِتْعَابُ النَّفْسِ الْأَمَّارَةِ بِالسُّوءِ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ تَعَالَى ، وَذٰلِکَ لَا يَحْصُلُ بِالنَّائِبِ أَصْلًا وَلَا تُجْزِی النِّيَابَةُ فِي أَدَائِهَا.

(۱) الفروق:۲/۳۶۱، الذخیرۃ:۳/۱۹۴

(حاصل یہ ہے کہ عبادات مالیہ سے مقصود مال کا محتاج کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صرف کرنا ہے اور یہ بات نیابت کی صورت میں بھی حاصل ہو جاتی ہے؛لہذا ان میں قدرت اور عذر دونوں صورتوں میں نیابت جائز ہے۔ اور عبادات بدنیہ سے مقصود اللہ کی مرضیات کی جستجو میں یا تو اعضاء سے اللہ کی تعظیم ہے یا نفس امارہ بالسوء کو مجاہدے میں ڈالنا ہے۔اور یہ بات نائب سے بالکل حاصل نہیں ہو سکتی ،اور ان کی ادائیگی میں نیابت چل نہیں سکتی۔)(۱)

یہی بات علامہ ابن نجیم مصری نے ''البحر الرائق'' میں اور علامہ شامی نے ''رد المحتار'' میں بیان کی ہے۔(۲)

رہا حج جو دونوں عبادات کا جامع ہے تو اس میں ہمارے علما کہتے ہیں کہ اس میں اگر چہ دونوں صورتیں ہیں؛ مگر غالب انفاق کی صورت ہے؛ اس لیے اس کو غالب سمجھ کر حج میں بھی نیابت کی اجازت دی گئی ہے؛ مگر چوں کہ اس میں دوسری صورت عبادت بدنی کی بھی ہے اس لیے اس میں نیابت کا جواز صرف عجز و عذر کی صورت میں ہے۔(۳)

یہاں تک نیابت فی العبادات کے مسئلے کی تفصیل و تحقیق پیش کی گئی ،جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیابت کے مسئلے کی اصل کسی کی جانب سے ان کی عبادت کو انجام دینا ہے۔

نیابت فی العبادات اور ایصال ثواب کا فرق

اب سوال یہ ہے کہ نیابت فی العبادات کے مسئلے میں اور ایصال ثواب کے مسئلے میں

---

(۱) المبسوط:۴/۱۵۲

(۲) البحر الرائق:۳/۱۰۵، شامی:۱/۳۵۵

(۳) البسوط:۴/۱۵۲، البحر الرائق:۳/۱۰۷

کیا کوئی فرق ہے یا دونوں ایک ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ مسائل ہیں، ایک ہی مسئلے کے دو عنوان نہیں ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرات فقہائے کرام نے اگر چہ کہ ایصال ثواب کے مسئلے کو نیابت فی العبادات کے ضمن میں ذکر کیا ہے؛ مگر ایصال ثواب اور چیز ہے اور نیابت فی العبادت اور چیز؛ وجہ یہ ہے کہ نیابت فی العبادات سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کی کوئی ذمہ داری ادا کرے، جیسے کسی پر حج فرض تھا، اس کی جانب سے اس کا حج ادا کرے، یا اس کی کوئی نذر تھی، اس کو اس کی جانب سے ادا کرے، یا اس کی جانب سے نفل حج کرے؛ مگر ایصالِ ثواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک عبادت اپنی ہی جانب سے کرتا ہے اور اس کا ثواب کسی اور زندہ یا مردہ کو پہنچاتا ہے، اس میں کسی کی ذمہ داری ادا نہیں کی جاتی، نہ واجبی نہ نفلی؛ بل کہ جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اپنی جانب سے کیا جاتا ہے اور اس عمل وعبادت کا ثواب کسی کو پہنچا دیا جاتا ہے؛ لہذا یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں؛ کیوں کہ بعض اوقات حضرات فقہا کسی مناسبت سے ایک باب میں کسی اور چیز کا ذکر کر دیتے ہیں، لہذا اس کا دھیان رکھا جائے اور ہم نے بھی یہاں اسی مناسبت کی وجہ سے یا یوں کہیے کہ حضرات فقہا کے ذکر کرنے کی وجہ سے نیابت کا مسئلہ یہاں ذکر کر دیا ہے۔ اسی لیے غالباً علامہ شاطبی مالکی نے مسئلہ نیابت کے ذکر کے بعد لکھا کہ

"و يبقى النظرُ في مسألة لها تعلق بهذا الموضع ، و هي مسألة هبة الثواب"

ترجمہ: اب رہا یہ مسئلہ جس کا اس جگہ (نیابت والے مسئلے) سے تعلق ہے اور وہ ہے ثواب کا ہبہ کرنا۔(۱)

اس بات کی ایک دلیل یہ ہے کہ اوپر ہم نے دیکھا کہ علمائے حنفیہ نے عبادات بدنیہ

(۱) الموافقات: ۲/۲۴۰

میں نیابت کا عدم جواز بیان کیا ہے؛ مگر جہاں انھوں نے یہ نیابت والا مسئلہ لکھا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ

''وَالْأَصْلُ فِيهِ أَنَّ الْإِنْسَانَ لَهُ أَنْ يَجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِهِ لِغَيْرِهِ صَلَاةً أَوْ صَوْمًا أَوْ صَدَقَةً أَوْ قِرَاءَةَ قُرْآنٍ أَوْ ذِكْرًا أَوْ طَوَافًا أَوْ حَجًّا أَوْ عُمْرَةً أَوْ غَيْرَ ذَلِكَ عِنْدَ أَصْحَابِنَا .

ترجمہ: اس میں اصول یہ ہے کہ ہمارے علما کے نزدیک انسان کو اپنے اعمال کا ثواب کسی اور کے حق میں کر دینے کا اختیار ہے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ، صدقہ ہو یا قرآن کی تلاوت، ذکر ہو یا طواف و حج اور عمرہ وغیرہ۔(۱)

لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ہر چیز کا ثواب ایصال کیا جا سکتا ہے تو حدیث میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ

«لا يصوم أحد عن أحد ولا يصلي أحد عن أحد.»

تو انہی حضرات فقہائے کرام نے اس کا جواب ان الفاظ سے دیا ہے کہ:

''فَهُوَ فِي حَقِّ الْخُرُوجِ عَنِ الْعُهْدَةِ لَا فِي حَقِّ الثَّوَابِ''

ترجمہ: یہ حدیث تو ذمہ داری سے سبکدوشی کے بارے میں ہے نہ کہ ثواب کے بارے میں۔(۲)

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرات فقہائے کرام کے نزدیک نیابت کے مسئلے اور ایصالِ ثواب والے مسئلے میں فرق ہے، نیابت تو یہ ہے کہ کسی کی جانب سے اس کی ذمہ داری پوری کی جائے، جب کہ ایصالِ ثواب کسی کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کا نام نہیں ہے اور اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر گذری کہ مالی عبادات میں تو سبھی کے نزدیک اس کی گنجائش ہے؛ مگر بدنی عبادات میں بعض حضرات تو اس کی اجازت دیتے ہیں؛

---

(۱) دیکھو: الهداية: ۱/۱۸۳، البحر الرائق: ۳/۱۰۵، فتح القدير: ۱/۱۳۱

(۲) بدائع الصنائع: ۲/۲۱۲، البحر الرائق: ۳/۱۰۵، رد المحتار للشامي: ۲/۵۹۷

لیکن جمہور اس کو جائز نہیں قرار دیتے۔

لہٰذا ایصال ثواب والا مسئلہ نیابت فی العبادات سے الگ ایک مسئلہ ہے، یہاں ہمارے سامنے اصل یہی مسئلہ ہے۔

عبادات بدنیہ سے ایصالِ ثواب میں مسالک ائمہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ دراصل نیابت کے مسئلے میں بالذات داخل نہیں، جیسا کہ متعدد فقہائے کرام کا حوالہ گزر گیا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ بدنی عبادات جیسے نماز، روزہ، ذکر و تسبیح اور تلاوت وغیرہ کے ذریعے ایصالِ ثواب کا کیا حکم ہے؟ اور حضرات فقہائے کرام کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

ظاہر ہے کہ جو حضرات عباداتِ بدنیہ میں نیابت کو جائز مانتے ہیں، جیسے امام احمد بن حنبل، ان کے نزدیک عباداتِ بدنیہ کے ذریعے ایصالِ ثواب بدرجہ اولی جائز و درست ہوگا؛ کیوں کہ کسی کی ذمہ داری کو سر سے اتارنا بڑا کام ہے، جب کہ ایصالِ ثواب میں صرف اپنی کی ہوئی نیکی و عبادت کا ثواب دوسرے کو ہدیہ و ہبہ کرنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ پہلے کی بہ نسبت اخف و اہون ہے۔

ہاں جو حضرات بدنی عبادات میں نیابت کے قائل نہیں، جیسے امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی رحمہم اللہ، ان کے نزدیک ایصالِ ثواب کا کیا حکم ہے؟ کیا نیابت ہی کا حکم اس کو بھی ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں اقوال مختلف ہیں؛ مگر بعد مطالعہ و غور و فکر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جمہور کے نزدیک ایصالِ ثواب کی یہ صورت جائز ہے؛ لہٰذا پہلے چند اقوال ائمہ کے اس بارے میں معتبر کتب فقہ کے حوالوں سے نقل کیے جاتے ہیں، پھر ان پر کلام کیا جائے گا۔

حنفی مسلک

حنفیہ کا مسلک ایصالِ ثواب کے بارے میں کیا ہے؟ اس کا ذکر اوپر ابھی کر چکا ہوں،

یہ حضرات کہتے ہیں کہ

”وَالْأَصْلُ فِيهِ أَنَّ الْإِنْسَانَ لَهُ أَنْ يَجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِهِ لِغَيْرِهِ صَلَاةً أَوْ صَوْمًا أَوْ صَدَقَةً أَوْ قِرَاءَةَ قُرْآنٍ أَوْ ذِكْرًا أَوْ طَوَافًا أَوْ حَجًّا أَوْ عُمْرَةً أَوْ غَيْرَ ذَلِكَ عِنْدَ أَصْحَابِنَا“

ترجمہ: اس میں اصول یہ ہے کہ ہمارے علما کے نزدیک انسان کو اپنے اعمال کا ثواب کسی اور کے حق میں کر دینے کا اختیار ہے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ، صدقہ ہو یا قرآن کی تلاوت، ذکر ہو یا طواف و حج اور عمرہ وغیرہ۔(۱)

علامہ شامی نے ” منحة الخالق میں“ ”شرح تحفة الملوک “کے حوالے سے اس کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ

”يَصِحُّ أَنْ يَجْعَلَ الْإِنْسَانُ ثَوَابَ عِبَادَتِهِ النَّافِلَةِ لِغَيْرِهِ صَوْمًا أَوْ صَلَاةً أَوْ قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ أَوْ صَدَقَةً أَوِ الْأَذْكَارَ أَوْ غَيْرَهَا مِنْ أَنْوَاعِ الْبِرِّ۔“

ترجمہ: یہ بات صحیح ہے کہ انسان اپنی نفل عبادت کا ثواب دوسرے کے حق میں کر سکتا ہے خواہ وہ روزہ ہو یا نماز، قراءت ہو یا صدقہ یا اذکار ہوں یا دوسری کوئی عبادت اور نیکیاں۔(۲)

شافعی مسلک

شافعی مسلک میں عبادات بدنیہ کے بارے میں دو قول ملتے: ایک قول یہ ہے کہ بدنی عبادات میں ایصال ثواب نہیں ہو سکتا، جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ درست و جائز ہے اور متعدد حضرات شافعیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۱) دیکھو: الهداية :۱/۱۸۳، البحر الرائق :۳/۱۰۵، بدائع الصنائع :۲/۲۱۲، فتح القدير :۱/۱۳۱

(۲) منحة الخالق على البحر الرائق:۳/۱۰۷

چناں چہ امام نووی نے ''شرح مسلم'' میں اور ''کتاب الأذکار'' میں اس کی تصریح کی ہے، '' کتاب الأذکار '' میں ان کی عبارت یہ ہے کہ

''و اختلف العلماء في وصول ثواب قراء ة القرآن، فالمشهور من مذهب الشافعي وجماعة أنه لا يصل وذهب أحمد بن حنبل وجماعة من العلماء وجماعة من أصحاب الشافعي إلى أنه يصل ''

ترجمہ: علما نے قراءت قرآن کا ثواب پہنچنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس شافعی مسلک کا مشہور قول اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ نہیں پہنچتا اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ اور علما کی ایک جماعت اور امام شافعی کے اصحاب میں سے ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ پہنچتا ہے۔(۱)

اور شافعی مسلک کی مستند و معتبر کتاب ''تکملة المجموع ''میں ہے کہ:

''و قَالَ ابْنُ النَّحْوِيِّ فِيْ شَرْحِ الْمِنْهَاجِ: لاَ يَصِلُ إِلٰى الْمَيِّتِ عِنْدَنا ثَوَابُ الْقِرَاء ةِ عَلَى الْمَشْهُوْرِ ، وَ الْمُخْتَارُ الْوُصُوْلُ إِذَا سَأَلَ اللّٰهَ إِيْصَالَ ثَوَابِ قِرَاءَ تِهٖ ، وَ يَنْبَغِيْ الْجَزْمُ بِهٖ ، لِاَنَّهٗ دُعَاءٌ ، فَإِذَا جَازَ الدُّعَاءُ لِلْمَيِّتِ بِمَا لَيْسَ لِلدَّاعِيْ، فَلَاَنْ يَّجُوْزَ بِمَا هُوَ لَهٗ أَوْلٰى.''

ترجمہ: علامہ ابن النحوی نے '' شرح المنهاج ''میں فرمایا کہ ہمارے (شافعی حضرات کے) نزدیک قراءت کا ثواب مشہور قول پر نہیں پہنچتا؛ لیکن مختار قول یہ ہے کہ پہنچتا ہے جب اللہ سے اپنی قراءت کا ثواب پہنچانے کی درخواست کرے اور اسی بات پر جزم و یقین مناسب ہے؛ کیوں کہ یہ بھی ایک دعا ہے، پس جب دعا میت کے حق میں جائز ہے، جب

(۱) کتاب الأذکار :۱۷۷، نیز دیکھو شرح مسلم :۱/۴۲

کہ دعا کا ثواب دعا کرنے والے کے لیے نہیں ہوتا تو قراءت جس کا ثواب قاری کو حاصل ہے اس کا ایصال ثواب بدرجہ اولی درست ہونا چاہئے۔(۱)

علامہ ابوبکر دمیاطی شافعی رحمۃ اللہ نے "إعانة الطالبين" میں لکھا ہے کہ

"و حكى المصنف في شرح مسلم والأذكار وجهاً:أن ثواب القراء ة يصل إلى الميت، كمذهب الأئمة الثلاثة ، و اختاره جماعةٌ من الأصحاب ، منهم : ابن الصلاح، والمحب الطبري، و ابن أبي الدم ، وصاحب الذخائر، و ابن أبي عصرون ، وعليه عمل الناس ، و ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسنٌ "

ترجمہ: مصنف (علامہ نووی) نے شرح مسلم میں اور الاذکار میں ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ قراءت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے، جیسا کہ دوسرے تین اماموں کا مذہب ہے اور اسی کو ہمارے اصحاب میں سے ابن الصلاح، محبّ الطبری، ابن ابی الدم، صاحب الذخائر، اور ابن ابی عصرون نے اختیار کیا ہے اور اسی پر لوگوں کا عمل ہے اور جس چیز کو مسلمان مستحسن سمجھیں وہ اچھا ہی ہے۔(۲)

نیز اسی میں ثواب نہ پہنچنے کے قول کو شافعیہ کا ضعیف قول اور پہنچنے کے قول کو معتمد قول قرار دیا ہے۔

بعض حضرات شافعیہ نے اس سلسلے میں ایک اور توجیہ کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قبر کے پاس قراءت کی جائے؛ کیوں کہ اس سے مرحومین کو تلاوت کی برکت و رحمت حاصل ہوگی،

(۱) تکملة المجموع:۱۶/۵۰۹

(۲) إعانة الطالبين:۳/۲۵۸

پھر جب دعا کی جائے گی تو دعا کی قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے۔
امام رافعی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ

”وسئل القاضي أبو الطيب عن ختم القرآن في المقابر، فقال : الثواب للقارئ ، ويكون الميت كالحاضرين يُرجى له الرحمة و البركة ، فيستحب قراء ة القرآن في المقابر لهذا المعنى ، و أيضاً فالدعاء عقيب القراء ة أقرب إلىٰ الإجابة و الدعاء ينفع الميت. “

ترجمہ: قاضی ابو الطیب سے مقبروں میں ختم قرآن کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ: ثواب قاری کو ملے گا اور میت ایسے ہوگی جیسے حاضرین ہوتے ہیں، اس کے لیے رحمت و برکت کی امید ہے؛ لہٰذا مقبروں میں اسی وجہ سے قراءت قرآن مستحب ہے، نیز دعا تلاوت کے بعد قبولیت سے قریب ہوتی ہے اور دعا تو میت کے حق میں نفع بخش ہے ہی۔(۱)

الغرض اس سے معلوم ہوا کہ حضرات شوافع کے یہاں مختار قول یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کا ثواب مرحومین کو پہنچتا ہے۔

مالکی مسلک

مالکیہ حضرات کے یہاں بھی تلاوت وذکرواذکار کے ایصالِ ثواب میں دو قول ملتے ہیں: ایک یہ کہ یہ عمل مکروہ ہے اور اس سے ثواب نہیں ملتا، جیسا کہ ” منح الجلیل“ میں تصریح ہے۔(۲)

لیکن ان کے یہاں بھی بڑے بڑے محققین نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس سے

(۱) الشرح الكبير للرافعي:۵/۲۴۹
(۲) منح الجليل:۱/۳۰۵

مرحومین کو ثواب ونفع پہنچتا ہے اوران حضرات نے کراہت کے قول کو ایک خاص صورت پر محمول کیا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی تلاوت کر کے ثواب پہنچانے کے عمل کو مستقل کوئی سنت قرار دے، یعنی صرف یہ نہ سمجھے کہ یہ مشروع ہے؛ بل کہ یہ بھی سمجھے کہ یہ مستقل سنت ہے تو یہ مکروہ ہے، ورنہ مکروہ نہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی دینی کام کو کوئی درجہ سنت یا واجب وغیرہ کا دینا شارع کا کام ہے، کوئی دوسرا آدمی اپنی جانب سے کسی کام کو سنت یا واجب قرار نہیں دے سکتا؛ لہذا ان حضرات نے اسی نکتے کی وجہ سے فرمایا کہ یہ کام مشروع تو ہے؛ مگر اس کو مستقل سنت قرار دینا یعنی یہ سمجھنا کہ کسی کے مرجانے پر یہ سنت ہے کہ قرآن پڑھ پڑھ کر اس کو بخشا جائے اور ایسا نہ کرنے والوں کو مطعون کیا جائے تو یہ حدود سے تجاوز ہے؛ اس لیے مکروہ ہے، ورنہ مکروہ نہیں۔

مالکی مذہب کے عظیم فقیہ احمد بن غنیم بن سالم النفراوی نے فقہ مالکی پر ان کی لکھی ہوئی کتاب ''الفواكه الدواني ''میں فرمایا ہے:

''قال ابن عرفة وغيره من العلماء : و محل الكراهة عند مالك في تلك الحالة إذا فعلت على وجه السنية ، و أما لو فعلت على وجه التبرك بها ورجاء حصول بركة القرآن للميت فلا ، و أقول : هذا هو الذي يقصده الناس بالقراء ة فلا ينبغي كراهة ذلك في هذا الزمان ، وتصح الإجارة عليها. قال القرافي : والذي يظهر حصول بركة القرآن للأموات كحصولها بمجاورة الرجل الصالح ، و بالجملة فلا ينبغي إهمال أمر الموتى من القراء ة ولا من التهليل الذي يفعل عند الدفن ، و الاعتماد في ذلك كله على الله تعالىٰ وسعة رحمته . وذكر صاحب المدخل أن من أراد حصول بركة قراء ته و ثوابها للميت بلا خلاف فليجعل ذلك دعاء فيقول : اللهم أوصل ثواب ما

أقرؤه لفلان أو ما قرأته ، و حينئذ يحصل للميت ثواب القراء ة و للقارئ ثواب الدعاء .

ترجمہ: امام ابن عرفہ وغیرہ علما نے کہا کہ امام مالک کے نزدیک میت کے پاس قراءت کی کراہت کا محل وہ صورت ہے کہ اس کو سنت سمجھ کر کیا جائے، لیکن اگر تبرک کے لیے یا قرآن کی برکت کے حصول کی امید سے ہو تو مکروہ نہیں۔ (مولف کتاب علامہ نفراوی کہتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ لوگ اسی مقصد سے قراءت کا قصد کرتے ہیں؛ لہٰذا اس دور میں یہ مکروہ نہ ہونا چاہئے اور اس پر اجارہ بھی صحیح ہے، امام قرافی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ جو بات ظاہر ہے وہ یہ کہ اموات کو قرآن کی برکت حاصل ہوتی ہے، جیسے کسی نیک آدمی کے بازو دفن ہونے سے اس کی برکت حاصل ہوتی ہے، الغرض اموات کے معاملے میں قراءت سے یا لا الہ الا اللہ وغیرہ اذکار سے دفن کے وقت غفلت نہ برتنا چاہیے۔ اور ان سب امور میں اعتماد اللہ تعالی کی وسیع رحمت پر ہوتا ہے۔ صاحب مدخل نے فرمایا کہ جو شخص میت کے حق میں اختلافی صورت کے بغیر ثواب پہنچانا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ دعا کردے کہ اے اللہ! میں جو تلاوت کروں یا جو تلاوت میں نے کی ہے اس کا ثواب فلاں کو پہنچا دیجیے۔ اس صورت میں قراءت کا ثواب میت کو اور دعاء کا ثواب پڑھنے والے کو مل جائے گا۔ (۱)

اسی طرح مالکی فقیہ امام محمد بن عبد اللہ الخرشی رحمۃ اللہ نے بھی بعد البحث علامہ ابن الفرات کے حوالے سے امام القرافی کا قول لکھا ہے کہ

”الَّذِی یَتَّجِهُ أَنْ یَحْصُلَ لَهُمْ بَرَكَةُ الْقِرَاءَةِ كَمَا یَحْصُلُ لَهُمْ

(۱) الفواكه الدواني:۱/۴۳۷

بَرَكَةُ الرَّجُلِ الصَّالِحِ يُدْفَنُ عِنْدَهُمْ أَوْ يُدْفَنُونَ عِنْدَهُ ، وَوُصُولُ الْقِرَاءَةِ لِلْمَيِّتِ وَإِنْ حَصَلَ الْخِلَافُ فِيهَا فَلَا يَنْبَغِي إِهْمَالُهَا فَلَعَلَّ الْحَقَّ الْوُصُولُ فَإِنَّ هَذِهِ الْأُمُورَ مُغَيَّبَةٌ عَنَّا وَلَيْسَ الْخِلَافُ فِي حُكْمٍ شَرْعِيٍّ إِنَّمَا هُوَ فِي أَمْرٍ هَلْ يَقَعُ كَذَلِكَ ؟ وَكَذَا التَّهْلِيلُ الَّذِي عَادَةُ النَّاسِ يَعْمَلُونَهُ الْيَوْمَ وَيُعْتَمَدُ فِي ذَلِكَ عَلَى فَضْلِ اللَّهِ تَعَالَى "

ترجمہ: جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مرحومین کو قراءت کی برکت حاصل ہوتی ہے، جیسے ان کو نیک شخص کی برکت ملتی ہے جب اس کو مردوں کے پاس دفن کیا جاتا ہے یا مردوں کو اس نیک شخص کے پاس دفن کیا جاتا ہے اور میت کو قراءت کا ثواب پہنچنے میں اگر چہ کہ اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس سے غفلت مناسب نہیں ہے، ممکن ہے کہ پہنچتا ہو؛ کیوں کہ یہ امور ہم سے پوشیدہ ہیں اور اختلاف حکم شرعی میں نہیں؛ بل کہ اس امر میں ہے کہ ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح ذکر واذکار جن میں لوگوں کی آج عادت ہے کہ وہ اس کو انجام دیتے ہیں اور اس میں اللہ کے فضل پر اعتماد کیا جانا چاہیے۔(۱)

نیز مشہور مالکی فقیہ علامہ الدردیر رحمۃ اللہ نے کراہت کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

"لكن المتأخرون على أنه لا بأس بقراءة القرآن والذكر وجعل ثوابه للميت ويحصل له الأجر إن شاء الله ، وهو مذهب الصالحين من أهل الكشف".

ترجمہ: لیکن متاخرین مالکیہ اس پر ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں

(۱) شرح خليل للخرشي نسخة شاملة:٥/٤٦٧

کہ قراءت قرآن اور ذکر واذکار کیے جائیں اور اس کا ثواب میت کے حق میں کر دیں اور ان شاء اللہ اس کو اجر وثواب حاصل ہوگا، یہی اہل کشف میں سے نیک وصالح حضرات کا مسلک بھی ہے۔(۱)

علامہ دسوقی مالکی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ

''وَفِيهَا ثَلاثَةُ أَقْوَالٍ :تَصِلُ مُطْلَقًا، لَا تَصِلُ مُطْلَقًا ، وَالثَّالِثُ :إِنْ كَانَتْ عِنْدَ الْقَبْرِ وَصَلَتْ وَإِلَّا فَلا ، وَفِي آخِرِ نَوَازِلِ ابْنِ رُشْدٍ فِي السُّؤَالِ عَنْ قَوْلِه تَعَالَى (وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى) . قَالَ وَإِنْ قَرَأَ الرَّجُلُ وَأَهْدَى ثَوَابَ قِرَاءَتِهِ لِلْمَيِّتِ جَازَ ذٰلِکَ وَحَصَلَ لِلْمَيِّتِ أَجْرُهُ ا هـ . وَقَالَ ابْنُ هِلَالٍ فِي نَوَازِلِهِ الَّذِي أَفْتَى بِهِ ابْنُ رُشْدٍ، وَذَهَبَ إِلَيْهِ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَئِمَّتِنَا الْأَنْدَلُسِيِّينَ أَنَّ الْمَيِّتَ يَنْتَفِعُ بِقِرَائَةِ الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ وَيَصِلُ إِلَيْهِ نَفْعُهُ ،وَيَحْصُلُ لَهُ أَجْرُهُ إِذَا وَهَبَ الْقَارِئُ ثَوَابَهُ لَهُ ، وَبِهِ جَرَى عَمَلُ الْمُسْلِمِينَ شَرْقًا وَغَرْبًا وَوَقَفُوا عَلَى ذٰلِکَ أَوْقَافًا وَاسْتَمَرَّ عَلَيْهِ الْأَمْرُ مُنْذُ أَزْمِنَةٍ سَالِفَةٍ''.

ترجمہ :اس مسئلے میں تین قول ہیں :ایک یہ کہ ہر صورت میں ثواب پہنچتا ہے، دوسرا یہ کہ مطلقاً نہیں پہنچتا اور تیسرا یہ کہ اگر قبر کے پاس قراءت ہو تو پہنچتا ہے ورنہ نہیں، ابن رشد کی کتاب نوازل کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد (وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى) کے متعلق سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اگر آدمی قراءت کرے اور اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرے تو جائز ہے اور میت کو اس کا ثواب ملے گا ۔ اور علامہ ابن ھلال نے اپنی کتاب ''نوازل'' میں فرمایا کہ :امام ابن رشد نے جو فتویٰ دیا اور اندلس کے

(۱) الشرح الكبير للدردير مع حاشية الدسوقي:۱/۴۲۳

ہمارے ائمہ میں سے بہت سے حضرات جس کی جانب گئے ہیں وہ یہ ہے کہ میت کو قراءت قرآن کریم سے نفع ہوتا ہے اور اس کا نفع اس کو پہنچتا ہے اور اس کا ثواب بھی اس کو پہنچتا ہے، جب کہ پڑھنے والا اس کا ثواب اس کو ہبہ کرتا ہے اور اسی پر مشرق تا مغرب مسلمانوں کا عمل بھی ہے اور مسلمانوں نے اس کے لیے بہت سے اوقاف وقف کیے ہیں اور سابقہ زمانوں سے اسی پر عمل برابر جاری ہے۔(۱)

ان مالکی فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوا کہ

۱- مرحومین کو قرآن کریم کی تلاوت اور ذکر و اذکار کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ اس میں مالکی فقہا میں اختلاف ہے اور اس میں ایک قول کراہت کا اور ایک قول جواز کا ہے۔

۲- ان اقوال میں سے جواز کا قول بہت سے فقہا کا مختار و پسندیدہ قول ہے اور اسی کو متاخرین مالکیہ نے اختیار کیا ہے۔

۳- یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی پر اہل اسلام میں شرقاً و غرباً عمل بھی دیکھا جاتا ہے۔

حنبلی مسلک

حنبلی مسلک کی کتب میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ مذکور ہے کہ ہر قسم کی طاعت کا ثواب مرحومین کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ اور خود امام احمد رحمہ اللہ سے بھی بعض کتب میں یہ قول براہ راست نقل کیا گیا ہے۔

فقہ حنبلی کی کتاب "مطالب أولي النهى "میں ،فقہ شافعی کی کتاب "إعانة الطالبين "اور "فتح الوهاب شرح منهج الطلاب"میں ، فقہ مالکی کی کتاب "مواهب الجليل"،میں لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ

" إذا دخلتم المقابر فاقرؤا الفاتحة والمعوذتين ، و قل هو اللّٰه أحد ، واجعلوا ثواب ذلک لأهل المقابر فإنه يصل إليهم ."

---

(۱) حاشیه الدسوقی:۱/۴۲۳

ترجمہ: جب تم قبرستان میں داخل ہو تو سورۃ الفاتحہ اور معوذتین (یعنی سورہ فلق وناس) اور سورہ قل ھو اللہ أحد پڑھو اور اس کا ثواب قبر والوں کو پہنچا دو؛ کیوں کہ یہ ان کو پہنچتا ہے۔(۱)

علامہ منصور بن یونس البہوتی رحمۃ اللہ "کشاف القناع عن متن الإقناع" میں فرماتے ہیں کہ

وَكُلُّ قُرْبَةٍ فَعَلَهَا الْمُسْلِمُ وَجُعِلَ ثَوَابُهَا أَوْ بَعْضُهَا كَالنِّصْفِ وَنَحْوِهِ كَالثُّلُثِ أَوْ الرُّبُعِ (لِمُسْلِمٍ حَيٍّ أَوْ مَيِّتٍ جَازَ) ذَلِكَ (وَنَفَعَهُ ذَلِكَ لِحُصُولِ الثَّوَابِ لَهُ، حَتَّى لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ذَكَرَهُ الْمَجْدُ (مِنْ) بَيَانٌ لِكُلِّ قُرْبَةٍ (تَطَوُّعٍ وَوَاجِبٍ تَدْخُلُهُ النِّيَابَةُ كَحَجٍّ وَنَحْوِهِ) كَصَوْمِ نَذْرٍ (أَوْ لَا) تَدْخُلُهُ النِّيَابَةُ (كَصَلَاةٍ وَكَدُعَاءٍ وَاسْتِغْفَارٍ، وَصَدَقَةٍ) وَعِتْقٍ (وَأُضْحِيَّةٍ وَأَدَاءِ دَيْنٍ وَصَوْمٍ وَكَذَا قِرَاءَةٍ وَغَيْرِهَا) قَالَ أَحْمَدُ: الْمَيِّتُ يَصِلُ إلَيْهِ كُلُّ شَيْءٍ مِنْ الْخَيْرِ، لِلنُّصُوصِ الْوَارِدَةِ فِيهِ وَلِأَنَّ الْمُسْلِمِينَ يَجْتَمِعُونَ فِي كُلِّ مِصْرٍ وَيَقْرَءُونَ وَيَهْدُونَ لِمَوْتَاهُمْ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ فَكَانَ إجْمَاعًا."

ترجمہ: ہر نیکی جسے مسلمان ادا کرے اور اس کا پورا یا بعض ثواب جیسے آدھا یا تہائی یا چوتھائی کسی زندہ یا مردہ مسلمان کے حق میں کر دیا جائے، تو جائز ہے اور یہ نفع بخش ہے؛ کیوں کہ اس سے اس میت کو ثواب پہنچتا ہے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور یہ نیکی خواہ نفل ہو یا ایسا واجب جس میں نیابت چلتی ہے جیسے حج یا نذر کے روزے یا ایسا واجب

(۱) إعانة الطالبين: ۱۴۲/۲، فتح الوهاب: ۲۵۲/۲، مواهب الجليل: ۵۱/۳

جس میں نیابت نہیں چلتی جیسے نماز، دعا، استغفار، صدقہ، غلام آزاد کرنا یا قربانی یا قرض کی ادائیگی اور روزہ، اسی طرح قرآن کی تلاوت وغیرہ، امام احمد نے فرمایا کہ میت کو ان سب اعمالِ خیر کا ثواب پہنچتا ہے ان احادیث کی وجہ سے جو وارد ہیں اور اس لیے بھی کہ بلا نکیر ہر شہر میں مسلمان جمع ہوتے اور قرآن پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو پہنچاتے آرہے ہیں، لہٰذا یہ اجماع ہوگیا۔(۱)

حنبلی فقہ کی معروف و مستند کتاب "المبدع شرح المقنع" میں ہے کہ

" وأي قربة فعلها من دعاء واستغفار وصلاة وصوم وحج وقراءة وغير ذلك ، وجعل ثواب ذلك للميت المسلم نفعه ذلك. قال أحمد : الميت يصل إليه كل شيء من الخير للنصوص الواردة فيه ؛ ولأن المسلمين يجتمعون في كل مصر ، ويقرؤون ويهدون لموتاهم من غير نكير ، فكان إجماعاً ، وكالدعاء والاستغفار حتى لو أهداها للنبي صلى الله عليه وسلم جاز ، ووصل إليه الثواب ، ذكره المجد."

ترجمہ: کوئی بھی نیکی دعا، استغفار، نماز، روزہ، حج، قراءت وغیرہ کر کے اس کا ثواب کسی مسلمان میت کو پہنچائے، تو یہ میت کے حق میں نفع بخش ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ نے کہا کہ میت کو ہر نیکی کا ثواب پہنچتا ہے ان نصوص کی وجہ سے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اور اس لیے کہ مسلمان ہر دور میں بلا نکیر ایسا کرتے آئے ہیں کہ جمع ہو کر قرآن کی تلاوت کرتے اور اپنے مردوں کو اس کا ثواب ہدیہ کرتے تھے؛ لہٰذا اس پر اجماع ہوگیا اور یہ دعا و استغفار کی طرح اجماعی مسئلہ ہوگیا، حتی کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا ثواب بخشے تو آپ کو بھی اس کا ثواب

---

(۱) كشاف القناع: ۱/ ۶۱۷

پہنچتا ہے۔)(۱)

اسی طرح حنبلی فقیہ علامہ بہاء الدین المقدسی نے ''العدة شرح العمدة: ۱/۱۲۰'' میں، فقہ حنبلی کے نامور فقیہ علامہ موفق الدین بن قدامہ نے ''الكافي: ۲/۸۲'' علامہ شرف الدین موسیٰ الحجاوی نے ''زاد المستنقع: ۱/۴۷'' میں، علامہ علاء الدین ابوالحسن علی بن سلیمان المرداوی نے ''الإنصاف: ۲/۵۵۷'' میں، علامہ صالح بن ابراہیم البلیہی نے ''السلسبيل: ۱/۲۴۳'' میں یہی بات لکھی ہے۔

بدنی عبادات سے ایصالِ ثواب اور علامہ ابن تیمیہ:

یہیں یہ وضاحت کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ بدنی اعمال وعبادات جن میں تلاوت قرآن بھی داخل ہے کا ثواب مرحومین کو پہنچتا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاوی میں ایک جگہ پوری صفائی و وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

فَلا نِزَاعَ بَيْنَ عُلَمَاءِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ فِي وُصُولِ ثَوَابِ الْعِبَادَاتِ الْمَالِيَّةِ كَالصَّدَقَةِ وَالْعِتْقِ كَمَا يَصِلُ إِلَيْهِ أَيْضًا الدُّعَاءُ وَالاسْتِغْفَارُ وَالصَّلاةُ عَلَيْهِ صَلاةَ الْجَنَازَةِ وَالدُّعَاءُ عِنْدَ قَبْرِه . وَتَنَازَعُوا فِي وُصُولِ الْأَعْمَالِ الْبَدَنِيَّةِ : كَالصَّوْمِ وَالصَّلاةِ وَالْقِرَاءَةِ وَالصَّوَابُ أَنَّ الْجَمِيعَ يَصِلُ إِلَيْه''.

ترجمہ: علمائے اہل سنت والجماعت کے مابین اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عبادات مالیہ جیسے صدقہ کرنے اور غلام کو آزاد کرنے کا ثواب پہنچتا ہے جس طرح دعا، استغفار، نماز جنازہ اور قبر کے پاس دعا کرنے کا ثواب پہنچتا ہے اور عبادات بدنیہ کے بارے میں علما نے اختلاف کیا،

(۱) المبدع شرح المقنع: ۲/۲۸۱

جیسے روزہ، نماز، قراءت؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام عبادات کا ثواب پہنچتا ہے۔(1)

نیز آپ نے اس سلسلے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی لکھا ہے، وہ سوال و جواب ملاحظہ کیجیے:

"سُئِلَ :عَنْ قِرَاءَ ةِ أَهْلِ الْمَيِّتِ تَصِلُ إِلَيْهِ؟ وَالتَّسْبِيحُ وَالتَّحْمِيدُ، وَالتَّهْلِيلُ وَالتَّكْبِيرُ، إِذَا أَهْدَاهُ إِلَى الْمَيِّتِ يَصِلُ إِلَيْهِ ثَوَابُهَا أَمْ لَا؟

ترجمہ: سوال کیا گیا، اہلِ میت کے قرآن پڑھنے کے بارے میں کہ کیا اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ اور اللّٰہ اکبر پڑھ کر اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرنے کے بارے میں کہ کیا اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں۔

الْجَوَابُ:يَصِلُ إِلَى الْمَيِّتِ قِرَاءَ ةُ أَهْلِهِ، وَتَسْبِيحُهُمْ، وَتَكْبِيرُهُمْ، وَسَائِرُ ذِكْرِهِمْ لِلَّهِ تَعَالَى، إِذَا أَهْدَوْهُ إِلَى الْمَيِّتِ، وَصَلَ إِلَيْهِ، وَاللَّهُ أَعْلَم.

ترجمہ: جواب یہ ہے کہ میت کے اہلِ خانہ کے قراءت کرنے، تسبیح و تکبیر کرنے اور دیگر تمام اذکار کا ثواب میت کو پہنچتا ہے جب وہ میت کو ہدیہ کریں۔(۲)

ان عبارات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صاف لکھا ہے کہ ہر قسم کی عبادت کا ثواب پہنچنا ہی صحیح قول ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کا بھی یہی مسلک ہے۔

مگر بعض حضرات کو شاید علامہ کی ایک عبارت سے دھوکہ لگا ہے کہ وہ اس سے یہ سمجھنے لگے کہ علامہ ابن تیمیہ اس مسئلے میں عدمِ جواز کے قائل ہیں؛ مگر اوپر کی عبارت نے

---

(۱) مجموع الفتاوی لابن تیمیة :۲۴/۳۶۶

(۲) مجموع الفتاوی:۲۴/۳۲۴، الفتاوی الکبری:۳/۳۸

فیصلہ کر دیا کہ علامہ کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ مرحومین کو ان بدنی اعمال ذکر و تلاوت وغیرہ کا ثواب ملتا ہے۔

رہی وہ عبارت جس سے بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے تو پہلے وہ عبارت دیکھ لیجیے ،پھر اس کی توضیح کروں گا۔علامہ ابن تیمیہ نے ایک جگہ یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس مسئلے میں علمائے کرام کے کیا کیا مسالک ہیں، پھر ان لوگوں کا مسلک بیان کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ثواب ہر نیکی کا ملتا و پہنچتا ہے، پھر ان کی دلیل ذکر کی ہے پھر اخیر میں یہ لکھا ہے کہ:

”مَعَ هَذَا لَمْ يَكُنْ مِنْ عَادَةِ السَّلَفِ إِذَا صَلَّوْا تَطَوُّعًا، وَصَامُوا، وَحَجُّوا، أَوْ قَرَءُوا الْقُرْآنَ ، يُهْدُونَ ثَوَابَ ذَلِكَ لِمَوْتَاهُمُ الْمُسْلِمِينَ، وَلَا لِخُصُوصِهِمْ، بَلْ كَانَ عَادَتُهُمْ كَمَا تَقَدَّمَ، فَلَا يَنْبَغِي لِلنَّاسِ أَنْ يَعْدِلُوا عَنْ طَرِيقِ السَّلَفِ، فَإِنَّهُ أَفْضَلُ وَأَكْمَلُ ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ“ .

ترجمہ: اس کے باجود سلف کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ وہ جب بھی نماز نفل پڑھتے یا روزے رکھتے یا حج کرتے یا قراءت کرتے تو ان کا ثواب اپنے موتی کو بخشتے اور نہ خاص مردوں کو؛ بل کہ ان کی عادت وہ تھی جو اوپر گزری، (کہ وہ مردوں کے حق میں دعائیں کیا کرتے تھے) لہٰذا مناسب ہے کہ سلف کے عام طریقے سے اعراض نہ کیا جائے؛ کیوں کہ وہ افضل و اکمل ہے۔(۱)

اس سے بعض لوگ یہ سمجھنے اور سمجھانے لگے کہ علامہ ابن تیمیہ یہ بیان کر رہے ہیں کہ ایصالِ ثواب کا یہ عمل سنت و طریق سلف کے خلاف ہے؛ لہٰذا یہ بدعت ہے؛ مگر علامہ کی اس عبارت کا یہ مفہوم پیدا کرنا سراسر غلط ہے؛ کیوں کہ علامہ تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سلف کا یہ معمول نہیں تھا کہ جب بھی وہ کوئی عبادت ، نماز نفل ، روزہ یا حج یا تلاوت

(۱) مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ :۲۴/۳۲۲

وغیرہ کرتے تو اس کا ثواب دوسروں کو پہنچاتے۔ یعنی ہر نیکی وعبادت کا ثواب مردوں کو پہنچانا ان کا معمول نہیں تھا۔ اس سے یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ ایصالِ ثواب کا عمل ہی سرے سے خلاف سنت یا بدعت وگمراہی ہے؟ جبکہ خود علامہ نے اسی کو صواب وحق بتایا ہے کہ ثواب پہنچتا ہے۔

احقر کا خیال یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ اس عبارت میں دراصل اس رسم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں جو عوام میں رائج ہے کہ ہر تلاوت کے بعد اس کا ثواب بخشتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ صحابہ یا تابعین وغیرہ کا کوئی معمول نہیں تھا؛ لہٰذا اس کا اس طرح اہتمام کرنا یہ خلاف طریق سلف ہے، واللہ اعلم۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کا مسلک

اسی طرح علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ تمام بدنی عبادات حتی کہ تلاوت قرآن کا ایصال ثواب درست و جائز ہے، آپ کی کتاب ''الروح'' سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام عبادات بدنیہ کے ثواب پہنچنے کے قائل ہیں اور اس پر انھوں اس کتاب میں سیر حاصل بحث کر دی ہے۔ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں کہ:

''وبالجملة فأفضل ما يهدى إلى الميت العتق والصدقة والاستغفار له والدعاء له والحج عنه، وأما قراءة القرآن وإهداؤها له تطوعاً بغير أجرة فهذا يصل إليه كما يصل ثواب الصوم والحج''.

(خلاصہ یہ کہ میت کے لیے جس کا ہدیہ دینا افضل ہے وہ غلام کا آزاد کرنا، صدقہ دینا، اس کے لیے استغفار ودعا کرنا اور اس کی جانب سے حج کرنا ہے، رہا قرآن کی تلاوت اور اس کا بلا اجرت میت کو بھیجنا، تو یہ بھی اس کو پہنچتا ہے جس طرح کہ روزے اور حج کا ثواب پہنچتا ہے۔ (۱)

(۱) كتاب الروح بتحقيق بسام على سلامة العموش: ۴۹۷

علمائے اہلِ حدیث کے بدنی عبادات کے سلسلے میں فتاوی:

اس سلسلے میں متعدد اکابر علمائے اہلِ حدیث کا بھی مسلک یہی ہے کہ بدنی عبادات، جن میں تلاوت قرآن وذکروغیرہ بھی شامل ہیں، ان کا ثواب اموات کو پہنچتا اوران کو اس کا نفع ملتا ہے۔ یہاں ہم چند اہم اکابر علمائے اہل حدیث کے فتاوی نقل کرتے ہیں۔

(۱) معروف اہلِ حدیث عالم ومحدث علامہ امیر الیمانی رحمۃ اللہ نے ”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ میں ایک حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

”و فيه أن هذه الأدعية ونحوها نافعة للميت بلا خلاف ، وأما غيرها من قراء ة القرآن له فالشافعي يقول : لا يصل ذلک إليه ، وذهب أحمد، وجماعة من العلماء إلى وصول ذلک إليه وذهب جماعة من أهل السنة و الحنفية إلى أن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره ، صلاةً كان أو صوماً ، أو حجاً ، أو صدقةً ، أو قراء ة قرآن، أو ذكراً، أو أي أنواع القرب ، و هذا هو القول الأرجح دليلاً .

ترجمہ :اس حدیث میں یہ مسئلہ ہے کہ یہ دعائیں اوراس جیسی دعائیں میت کو نفع پہنچاتی ہیں، اب رہی ان کے علاوہ میت کے لیے قرآن کی تلاوت تو امام شافعی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا اور امام احمد رحمۃ اللہ اور علما کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور اہل سنت علما کی ایک جماعت اور علمائے حنفیہ اس جانب گئے ہیں کہ انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب کسی دوسرے کو دے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا صدقہ، قرآن کی تلاوت ہو ذکرواذکار یا کسی اور قسم کی نیکی اور یہی قول دلیل کے لحاظ سے راجح ہے۔(۱)

(۱) سبل السلام:۲/۱۱۹

(۲) علامہ محمد بن علی الشوکانی رحمۃ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ سورۂ یٰسین پڑھ کر ثواب پہنچانے سے ثواب اموات کو پہنچتا ہے خواہ وہ پہنچانے والی اولاد ہو یا کوئی اور، چناں چہ وہ اپنی کتاب "نیل الأوطار" میں آیت: ﴿وأن لیس للإنسان إلا ما سعی﴾ کے بارے میں یہ لکھتے ہوئے کہ آیت عام نہیں ہے؛ بل کہ متعدد امور کے لحاظ سے مخصوص ہے، فرماتے ہیں کہ

"و بقراءۃ یٰسٓ من الولد وغیرہ لحدیث: اقرؤوا علی موتاکم یٰسٓ."

(یہ آیت مخصوص ہے سورہ لیس پڑھنے کے لحاظ سے بھی، خواہ پڑھنا اولاد کی جانب سے ہو یا دوسروں کی جانب سے؛ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ اپنے مردوں پر سورۂ لیس پڑھو۔ (۱))

(۳) علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری شارح ترمذی نے اپنے ایک طویل فتوے میں علامہ امیر محمد بن اسماعیل اور علامہ شوکانی رحمہا اللہ کے اقوال اس سلسلے میں نقل کر کے اسی کو اختیار کیا ہے کہ تمام قسم کی بدنی عبادات خواہ وہ نماز و روزہ ہو یا قرآن کی تلاوت وغیرہ سب کا ثواب اموات کو پہنچتا ہے، چناں چہ انھوں نے لکھا ہے:

متاخرین علمائے اہل حدیث سے علامہ محمد بن اسماعیل امیر نے "سبل السلام" میں مسلک حنفیہ کو راجح دلیلاً بتایا ہے، یعنی یہ کہا ہے کہ قرات قرآن اور تمام عباداتِ بدنیہ کا ثواب میت کو پہنچنا از روئے دلیل کے زیادہ قوی ہے اور علامہ شوکانی نے بھی "نیل الأوطار" میں اسی کو حق کہا ہے؛ مگر اولاد کے ساتھ خاص کیا ہے، یعنی یہ کہا ہے کہ اولاد اپنے والدین کے لیے قرات قرآن، یا جس عبادت بدنی کا ثواب پہنچانا چاہے تو جائز ہے ؛ کیوں کہ اولاد کا تمام عملِ خیر، مالی ہو خواہ بدنی اور بدنی میں قرات قرآن ہو یا نماز یا روزہ یا

(۱) نیل الأوطار: ۵/۱۸۶، بتحقیق: أبو معاذ طارق

کچھ اور سب والدین کو پہنچتا ہے۔"(۱)

(۴) معروف اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے کہ

قرآن مجید پڑھ کر یا صدقہ خیرات کر کے میت کے لیے استغفار کرنا جائز؛ بل کہ احسن طریقہ ہے، رسمی طور پر دن مقرر نہ کرے۔"(۲)

(۵) نیز اہل حدیث عالم علامہ وحید الزماں حیدرآبادی نے بھی اہل حدیث حضرات کا مسلک یہی بیان کیا ہے، وہ اپنی کتاب "نزل الأبرار" میں لکھتے ہیں کہ

"والأموات تنتفع بسعي الأحياء ، و ثواب كل عبادة يصل إليهم من الصلاة والصدقة، والصوم ، و تلاوة القرآن ، والذكر ."

ترجمہ: اموات کو زندوں کے عمل سے فائدہ پہنچتا ہے اور نماز، صدقہ، روزہ، تلاوت قرآن اور ذکر جیسی تمام عبادات کا ثواب ان کو پہنچتا ہے۔(۳)

(۶) حافظ عبداللہ روپڑی نے قرآن خوانی اور اس کے ایصالِ ثواب کے سلسلے میں کیے گئے ایک سوال کے جواب میں بہت تفصیلی فتوی لکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"رہا قرآن مجید قبر پر پڑھنا سو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ جیسے آج کل رواج ہے کہ قبر پر مجاور بن کر پڑھتے ہیں، نیز سال کے بعد عرس کرتے ہیں، دور دراز سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور قرآن مجید پڑھتے ہیں، اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں .... دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی خاص طریقہ مقرر نہ کرے؛ بل کہ جب اتفاق پڑے عام طور پر قبروں کی زیارت کرے اور اس وقت قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھ کر اس کا

(۱) بحوالہ فتاوی نذیریہ: ۱/ ۲۲۷-۱۸۷

(۲) فتاوی ثنائیہ: ۲/ ۳۴

(۳) نزل الأبرار: ۱/ ۷

ثواب میت کو بخش دے۔ اس میں اختلاف ہے۔ (اس کے بعد چند روایات سیوطی کے حوالے سے لکھ کر آگے خلاصہ لکھتے ہیں کہ) امام سیوطی رحمۃ اللہ نے ان احادیث کے مجموعہ پر حسن یا صحیح ہونے کا حکم اس لیے نہیں لگایا کہ ان میں ضعف زیادہ ہے، اگر ضعف تھوڑا ہوتا تو مجموعہ مل کر حسن یا صحیح کے درجے کو پہنچ جاتا۔ خیر ان پر عمل سے روکا نہیں جاتا، خاص کر جب کہ امام بھی اس طرف گئے ہیں، چناں چہ اوپر امام احمد بن حنبل وغیرہ سے نقل ہو چکا ہے۔ .... بہ ہر صورت عمل میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ فضائل اعمال میں ضعیف بھی معتبر ہے؛ مگر عمل کا کوئی طریق اپنی طرف سے مقرر نہ کرنا چاہیے۔ (۱)

عبادات بدنیہ سے ایصالِ ثواب پر اجماع کا ذکر

اس کے ساتھ یہاں یہ بھی لائق توجہ ہے کہ متعدد حضرات نے بدنی عبادات بالخصوص تلاوت سے ایصالِ ثواب پر اجماع نقل کیا ہے اور بعض نے اہلِ اسلام کا بلا نکیر اس پر عمل بیان کیا ہے۔

جن حضرات نے اجماع، یا اہل اسلام کا اس پر عمل نقل کیا ہے، ان میں سے ایک تو خود امام احمد رحمۃ اللہ بھی ہیں، جن کا مقولہ ہم نے اوپر متعدد حضرات سے نقل کیا ہے۔

حنبلی فقہ کی معروف و مستند کتاب " المبدع شرح المقنع " میں اور علامہ منصور بن یونس البہوتی رحمۃ اللہ "کشّاف القِناع عن متن الإقْناع "میں فرماتے ہیں کہ

" قَالَ أَحْمَدُ:الْمَيِّتُ يَصِلُ إِلَيْهِ كُلُّ شَيْئٍ مِنَ الْخَيْرِ ، لِلنُّصُوصِ الْوَارِدَةِ فِيهِ ؛ وَلِأَنَّ الْمُسْلِمِينَ يَجْتَمِعُونَ فِي كُلِّ مِصْرٍ وَيَقْرَءُونَ وَيَهْدُونَ لِمَوْتَاهُمْ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ فَكَانَ إِجْمَاعًا ."

---

(۱) فتاوی اهل حدیث:۲/۴۷۳-۴۷۰

ترجمہ: امام احمد رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میت کو ان سب اعمالِ خیر کا ثواب پہنچتا ہے ان احادیث کی وجہ سے جو وارد ہیں اور اس لیے بھی کہ بلا نکیر ہر شہر میں مسلمان جمع ہوتے اور قرآن پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو پہنچاتے آئے ہیں؛ لہذا یہ اجماع ہوگیا۔(۱)

اجماع کی یہ بات امام ابن قدامہ الحنبلی نے بھی "المغني" میں بیان کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"وَلَنَا مَا ذَكَرْنَاهُ ، وَأَنَّهُ إِجْمَاعُ الْمُسْلِمِينَ ؛ فَإِنَّهُمْ فِي كُلِّ عَصْرٍ وَمِصْرٍ يَجْتَمِعُونَ وَيَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ ، وَيُهْدُونَ ثَوَابَهُ إِلَى مَوْتَاهُمْ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ"

ترجمہ: اور ہماری دلیل وہ احادیث ہیں جو ہم نے ذکر کردیں اور یہ بھی دلیل ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے؛ کیوں کہ وہ ہر زمانے اور علاقے میں بلا کسی نکیر کے جمع ہوکر قرآن پڑھتے اور موتی کو اس کا ثواب ہدیہ کرتے چلے آرہے ہیں۔(۲)

یہی امام ابن قدامہ الحنبلی رحمۃ اللہ نے اپنی دوسری کتاب " الكافي" میں فرمایا کہ

"وإن فعل عبادة بدنية كالقراءة والصلاة والصوم وجعل ثوابها للميت نفعه أيضاً ؛ لأنه إحدى العبادات فأشبهت الواجبات ؛ ولأن المسلمين يجتمعون في كل مصر ، ويقرؤون ، ويهدون لموتاهم ، ولم ينكره منكر ؛ فكان إجماعاً".

ترجمہ: اور اگر کوئی بدنی عبادت انجام دے جیسے تلاوت، نماز، روزہ اور ان کا ثواب میت کو پہنچائے تو اس کو اس کا نفع ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی

---

(۱) المبدع شرح المقنع:۲/۲۸۱، کشاف القناع:۱/۶۱۷

(۲) المغني:۳/۵۲۲

عبادات میں سے ایک قسم کی عبادت ہے؛ لہذا یہ واجبات کے مشابہ ہوئیں، (جن میں نیابت چلتی ہے) اور اس لیے بھی کہ مسلمان ہر علاقے میں جمع ہوتے اور قرآن پڑھتے اور اس کا ثواب اموات کو ہدیہ کرتے چلے آئے ہیں، اور ان پر کسی نے نکیر نہیں کی؛ لہذا یہ اجماع ہوگیا۔(۱)

نیز حنفی فقیہ علامہ علاء الدین الکاسانی نے "**بدائع الصنائع**" میں لکھا کہ

"**وَعَلَيْهِ عَمَلُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ لَدُنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى يَوْمِنَا هٰذَا مِنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ عَلَيْهَا**"

ترجمہ: اور اسی پر مسلمانوں کا عمل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہمارے اس زمانے تک کہ زیارت قبور کرتے اور وہاں قرآن پڑھتے ہیں۔(۲)

ہم نے اوپر علامہ ابو بکر دمیاطی شافعی کا کلام ان کی کتاب "**إعانة الطالبين**" سے نقل کردیا ہے کہ

"**وعليه عمل الناس ، و ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن**"

ترجمہ: اسی پر لوگوں کا عمل ہے اور جس چیز کو مسلمان مستحسن سمجھیں وہ اچھا ہی ہے۔(۳)

اسی طرح علامہ دسوقی مالکی سے بھی نقل کر چکے ہیں کہ

"**وَ بِهِ جَرَى عَمَلُ الْمُسْلِمِينَ شَرْقًا وَغَرْبًا وَ وَقَفُوا عَلَى ذٰلِكَ أَوْقَافًا وَاسْتَمَرَّ عَلَيْهِ الْأَمْرُ مُنْذُ أَزْمِنَةٍ سَالِفَةٍ**"

---

(۱) الكافي: ۲/ ۴۳

(۲) بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۲

(۳) إعانة الطالبين: ۳/ ۲۵۸

ترجمہ: اور اسی پر مشرق تا مغرب مسلمانوں کا عمل بھی ہے اور مسلمانوں نے اس کے لیے بہت سے اوقاف وقف کیے ہیں اور سابقہ زمانوں سے اسی پر عمل برابر جاری ہے۔(۱)

ان حضرات کے بیانات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن کی تلاوت اور اس کا ثواب اہلِ قبور و مردگان کو بخشنے کا رواج ایک قدیم رواج ہے اور عوام مسلمین کے علاوہ علماو اتقیا اور صالحین کے یہاں بھی اس کا رواج رہا ہے اور اس کو خواہ کوئی اجماع نہ مانے تاہم اہلِ اسلام کا عرف صالح تو ہے ہی اور ہر دو صورت میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ کوئی قابلِ نکیر بات نہیں؛ بل کہ سلف سے منقول عمل ہے۔

مختلف عبادات بدنیہ سے ایصال ثواب کے دلائل

عبادات بدنیہ کے متعلق مسالکِ ائمہ کا ذکر کیا جا چکا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ عبادات بدنیہ کا ثواب مرحومین کو پہنچانا جائز ہے اور یہ نفع دیتا ہے۔لہذا آیئے اس کی دلیل کی جانب توجہ کرتے ہیں، اس کی متعدد دلیلیں موجود ہیں، جن سے عبادات بدنیہ کا ثواب میت کو پہنچنے کا حق ہونا اور اس کو پہنچانے کا جواز معلوم ہوتا ہے ، یہاں ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

روزہ سے ایصال ثواب کے دلائل

حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

« بَيْنَا أَنَا جَالِسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذْ أَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ إِنِّي تَصَدَّقْتُ عَلَى أُمِّي بِجَارِيَةٍ وَإِنَّهَا مَاتَتْ . -قَالَ- فَقَالَ : وَجَبَ أَجْرُكِ وَرَدَّهَا عَلَيْكِ الْمِيرَاثُ. قَالَت: يَا رَسُولَ اللَّهِ ! إِنَّهُ كَانَ عَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ، أَفَأَصُومُ عَنْهَا؟

(۱) حاشية الدسوقي :۱/۴۲۳

قَالَ: صُومِي عَنْهَا. قَالَتْ: إِنَّهَا لَمْ تَحُجَّ قَطُّ ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا ؟ قَالَ: حُجِّي عَنْهَا. »

ترجمہ: اس اثناء میں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ کے پاس ایک عورت آئی، اس نے عرض کیا کہ میں نے میری والدہ کو ایک باندی صدقہ دیا تھا اور وہ انتقال کر گئی، آپ نے فرمایا کہ تیرا اجر واجب ہو گیا، اور اس باندی کو والدہ کی میراث نے تجھ پر لوٹا دیا۔ اس نے عرض کیا کہ میری والدہ پر ایک ماہ کے روزے بھی ہیں، کیا میں اس کی جانب سے روزے رکھ لوں؟ آپ نے کہا کہ اس کی جانب سے روزہ رکھ لینا، اس عورت نے عرض کیا کہ میری والدہ نے حج بالکل نہیں کیا، کیا میں اس کی جانب سے حج ادا کروں؟ آپ نے کہا کہ ہاں اس کی جانب سے حج ادا کر دو۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

« أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ مَاتَ ، وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ. »

ترجمہ: بلاشبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی شخص مر جائے اور اس پر روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے۔(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

« جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ أُمِّي مَاتَتْ ، وَعَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ، أَفَأَقْضِيهِ عَنْهَا ؟ قَالَ : نَعَمْ ، قَالَ : فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضَى. »

---

(۱) مسلم:۲۷۵۳، أحمد:۲۳۰۰۶

(۲) بخاري:۱۹۵۲، مسلم:۲۷۴۸، أبو داود:۲۴۰۲

ترجمہ: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہیں، کیا میں ان کی جانب سے قضا کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ ادا کیا جائے۔(۱)

روزے کے سلسلے میں اور بھی کئی احادیث موجود ہیں، یہاں چند کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ جو کہ ایک بدنی عبادت ہے اس کا کسی مرحوم کی جانب سے ادا کرنا درست ہے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔

میت کی جانب سے روزہ رکھنے کی تشریح

پھر بعض ائمہ تو اس میں فرض یا نذر کے روزوں کو بھی شامل مانتے ہیں کہ کسی مرحوم کی جانب سے اس کے فرض روزے یا نذر کے روزے بھی دوسرا شخص اور بالخصوص اس کا ولی ادا کر سکتا ہے اور بعض ائمہ اس کو نفلی روزوں پر محمول کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ کسی نے اپنی جانب سے نفل روزے رکھ کر اس کا ثواب کسی مرحوم کو پہنچا دیا تو یہ جائز ہے۔

حضرات فقہائے حنفیہ اور بعض دیگر فقہا کے نزدیک اس قسم کی احادیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مرنے والے پر فرض ونذر کے روزے ہوں تو اس کا ولی یا کوئی اور شخص ان روزوں کا فدیہ ادا کر دے، یہ فدیہ دینا ہی روزہ کا قائم مقام ہے۔ بعض نے کہا کہ مرنے والے کے روزے کوئی دوسرا شخص اس امید کے ساتھ ادا کر دے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے قبول فرمالیں گے، گویا یہ ضابطہ نہیں؛ بل کہ اللہ کے فضل سے ایک امید کا سبق ہے۔

ان احادیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ ایصالِ ثواب کے بارے میں ہیں، نیابت کے بارے میں نہیں۔ اور اسی لیے ہم نے بھی ان احادیث کو یہاں پیش کیا ہے؛ لہذا ایک

---

(۱) بخاري:۱۹۵۳، مسلم:۲۷۵۰

شخص اپنی جانب سے روزہ رکھے اور اس کا ثواب مرحوم کو پہنچا دے تو یہ جائز ہے؛ بل کہ مستحسن ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

”فالحاصل :أن الحديث محمولٌ على الإثابة دو ن النِيَابة، والتعبيرُ المذكورُ يُصْلِحُ لهما بدون تأويلٍ، لأنهما نِيَّتان أي قد يكونُ الصومُ عن أحدٍ بنية الإثابة ، وقد يكون بنية النِيَابة، ولا يَتَلَفَّظُ بها أصلاً، فَيُقَال في الإثابة أيضًا صَامَ عنه، كما يُقَال في النِيَابة بدون فرقٍ ، أمَّا حديثُ لا يصومُ أحدٌ عن أحدٍ ، فهو محمولٌ على النِيَابة، فلا تنافي بين الحديثين“ .

ترجمہ : حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث ثواب پہنچانے پر محمول ہے نہ کہ نیابت پر اور مذکورہ تعبیر ”عن فلان“(یعنی فلاں کی جانب سے) نیابت و اثابت دونوں معنوں کے لیے بلا تاویل چل سکتی ہے؛ کیوں کہ یہ نیابت و اثابت دونوں نیتیں ہیں،یعنی کبھی روزہ کسی کی جانب سے بہ نیت اثابت ہوتا ہے اور کبھی بہ نیت نیابت ہوتا ہے اور ان کا زبان سے بالکل تلفظ نہیں کیا جاتا ؛لہذا اثابت میں بھی کہا جا سکتا ہے ”صام عنه“جیسے نیابت میں کہا جاتا ہے بغیر فرق کے، رہی وہ حدیث جس میں ہے کہ کوئی کسی کا روزہ نہ رکھے یہ محمول ہے نیابت پر؛لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تنافی وتضاد نہیں ہے۔(۱)

اور یہی بات علامہ ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمائی ہے،وہ کہتے ہیں کہ

”و أما أنا فأقول :إن الصوم في الأحاديث المرفوعة يحمل على المراد به أن الولي يصوم صوم النذر عن الميت ، لكن لا بطريق النيابة عنه ؛ بل يصوم لنفسه ثم يوصل ثوابه إليه “ .

(۱) فيض الباري شرح بخاري:۴/۳۲۹

ترجمہ: لیکن میں کہتا ہوں کہ ان مرفوع احادیث میں روزہ کو محمول کیا جائے اس مراد پر کہ میت کا ولی نذر کے روزے اس کی جانب سے رکھے، لیکن بہ طریق نیابت نہیں؛ بل کہ وہ اپنی جانب سے رکھے پھر اس کا ثواب میت کو پہنچادے۔(۱)

علامہ ظفر احمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

’’اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان احادیث میں نذر ماننے والے کی جانب سے وصیت نہیں کی گئی ہے، لہذا یہ روزہ ولی کی جانب سے بطور تبرع ہوگا۔ نیز اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسند بزار کی ایک روایت میں ’’ان شاء‘‘ کا لفظ بھی ہے، یعنی ولی اگر چاہے تو میت کی جانب سے روزہ رکھے۔‘‘(۲)

الغرض ان احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مرحومین کی جانب سے روزہ جو کہ بدنی عبادت ہے رکھ سکتے ہیں، پھر علما نے اسی سے یہ اخذ کیا کہ جس طرح روزہ بدنی عبادت ہونے کے باوجود اس میں دوسرے کے لیے کرنے کی اجازت دی گئی ہے اسی پر قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ دیگر تمام بدنی عبادات کا بھی یہی حکم ہو۔

چناں چہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے ’’کتاب الروح‘‘ میں فرمایا کہ

’’والعبادات قسمان مالية وبدنية ، وقد نبه الشارع بوصول ثواب الصدقة على وصول ثواب سائر العبادات المالية ، و نبه بوصول ثواب الصوم على وصول ثواب سائر العبادات البدنية ، و أخبر بوصول ثواب الحج المركب من المالية والبدنية ، فالأنواع الثلاثة ثابتة بالنص والاعتبار ، و بالله التوفيق‘‘ .

---

(۱) إعلاء السنن:۶/۲۸۹۶

(۲) إعلاء السنن:۶/۲۸۹۶

ترجمہ: عبادات دو قسم کے ہیں: مالیہ و بدنیہ اور شارع نے صدقے کا ثواب پہنچنے کو بیان کر کے دیگر تمام مالی عبادات کے ثواب پہنچنے پر تنبیہ فرمادی ہے اور روزے کا ثواب پہنچنے کو بیان کر کے دیگر بدنی عبادات کے ثواب پہنچنے پر متنبہ کر دیا ہے اور حج جو دونوں عبادات بدنی و مالی کا مرکب ہے اس کا ثواب پہنچنے کی بھی آپ نے خبر دے دی؛
لہٰذا تینوں قسم کی عبادات کا ثواب پہنچنا نص وقیاس سے ثابت ہے۔[1]

ذکر وتلاوت سے ایصالِ ثواب کے دلائل

بدنی عبادات میں سے تلاوت قرآن، تسبیح وتحمید اور دیگر ذکر و اذکار بھی ہیں، ان سے ایصال ثواب کا حکم بھی وہی ہے جو اوپر روزہ کی عبادت کا حدیث سے معلوم ہوا۔ اس کے متعدد دلائل علما نے ذکر کیے ہیں، ان میں سے بعض دلائل صریح ہیں اور بعض صریح نہیں ہیں؛ لیکن ان سے اس مسئلے پر استدلال کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ آگے ہم ذکر کریں گے۔

پہلی دلیل

حضرت علاء بن اللجلاج کے صاحب زادے عبدالرحمن روایت کرتے ہیں کہ

قَالَ لِي أَبِي : يَا بنيَّ ! إِذَا أَنَا مُتُّ فَأَلْحِدْنِي، فَإِذَا وَضَعْتَنِي فِي لَحْدِي، فَقُلْ : بِسْمِ اللَّهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰه ، ثُمَّ سِنَّ عَلَيَّ الثَّرَى سِنًّا، ثُمَّ اقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِي بِفَاتِحَةِ الْبَقَرَةِ، وَخَاتِمَتِهَا، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُولُ ذٰلِكَ.

ترجمہ: مجھ سے میرے والد نے فرمایا کہ جب میری موت ہو جائے تو میرے لیے بغلی قبر بنانا، جب مجھے قبر میں رکھ دو تو **بسم الله وعلى ملة رسول الله** کہنا، پھر میرے اوپر مٹی آہستہ سے ڈالنا، پھر میرے

---

(۱) کتاب الروح بتحقیق بسام علي سلامه العموش:۴۵۱

سر کے پاس سورہ بقرہ کا شروع اور اخیر پڑھنا؛ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات کہتے ہوئے سنا ہے۔(۱)

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ نے مجمع الزوائد میں اس کے رجال کو قابل اعتبار و موثوقین کہا ہے اور علامہ ظہیر احسن النیموی نے "آثار السنن" میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔(۲)

راوی حدیث عبد الرحمٰن بن العلاء پر کلام

راقم کہتا ہے کہ یہاں ایک بات اہلِ علم کے لیے عرض کر دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ اس حدیث کی سند میں عبد الرحمٰن بن العلاء نامی ایک راوی ہیں، جن کے بارے میں عام طور پر کتب رجال میں یہ لکھا ہے کہ ان سے روایت کرنے والا راوی مبشر بن اسماعیل ہے اور علامہ ذہبی نے تو صاف یہ لکھ دیا کہ ان سے سوائے مبشر کے کوئی دوسرا روایت ہی نہیں کرتا۔(۳)

اور اسی کی بنا پر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ نے "**سلسلة الأحاديث الضعيفة**" میں ابن عمر کی ایک موقوف روایت پر کلام کرتے ہوئے جو یہاں اگلے نمبر پر ہم بیان کریں گے اور اس کی سند میں بھی یہی راوی عبد الرحمٰن بن العلاء واقع ہوئے ہیں ، یہ لکھا ہے کہ عبد الرحمٰن بن العلاء مجہول راوی ہے۔(۴)

شیخ ناصر الدین البانی پر نقد

راقم کہتا ہے کہ شیخ البانی کا یہ کلام قابل گرفت ہے؛ کیوں کہ اہل علم جانتے ہیں کہ علماء حدیث کے نزدیک مجہول اس کو کہتے ہیں جس سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی راوی ہو، جیسا خود شیخ البانی کے کلام میں بھی ہے؛ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ عبد الرحمٰن بن العلاء سے روایت کرنے والا کیا صرف ایک راوی مبشر بن اسماعیل ہے؟ کیا کوئی

(۱) طبراني :۱۵۸۳۳

(۲) مجمع الزوائد:۳/۱۶۲، آثار السنن:۲/۱۲۴

(۳) ميزان الاعتدال:۲/۵۷۹

(۴) دیکھو سلسلة الضعيفة :۹/۱۵۳، احکام الجنائز :۱۹۲

دوسرا ان سے روایت کرنے والا نہیں پایا جاتا؟ میں کہتا ہوں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "لسان المیزان" میں اور حافظ صفی الدین الخزرجی نے "**خلاصة تذهيب تهذيب الكمال**" میں عبد الرحمٰن بن العلاء کے تذکرے میں ان سے روایت کرنے والے ایک راوی کا نام "لیث بن ابی سلیم" ذکر کیا ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ان سے روایت کرنے والے دو شخص ہیں: ایک مبشر بن اسماعیل دوسرے لیث بن ابی سلیم، جب عبد الرحمن بن العلاء سے روایت کرنے والے دو ہیں، تو جہالت ذات ختم ہوگئی؛ لہذا یہ مجہول الذات نہ رہے۔

اب رہی جہالت وصف و حال تو عرض ہے کہ امام ابن حبان نے ان کو "کتاب الثقات" میں داخل کیا ہے۔(۲)

اور ان کا ثقات میں شمار کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے نزدیک ان کا وصف وحال معروف تھا اور وہ ثقاہت سے موصوف تھے؛ لہذا جہالت وصف و حال بھی منتفی ہوگئی۔ چناں چہ ابن حبان کی ثقات میں کسی راوی کے ذکر سے بڑے بڑے ائمہ محدثین نے راوی کے وصف ثقاہت پر استدلال کیا ہے؛ لیجیے چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

محدث علامہ ابن الملقن نے اپنی کتاب "البدر المنير" میں کئی جگہ ابن حبان کے ثقات میں کسی راوی کے ذکر کرنے سے جہالت وصف کے منتفی ہونے پر دلیل لی ہے۔ ایک حدیث ابوداود و حاکم کے حوالے سے ذکر کر کے لکھا کہ

"وَأَعَلَّهُ ابْنُ الْقَطَّانِ بِأَنْ قَالَ : فِيهِ صَالح بن أبي (عريب)، وَلَا يُعْرَفُ حَالُه ، وَلَا رَوَى عَنْهُ غَيْرُ عَبْدِ الْحَمِيدِ ، وَقَد غَلَطَ فِيْ كُلِّ مِّنْهُمَا ، أما الأول: فَقَدْ ذَكَرَهُ ابْنُ حِبَّان فِيْ ثِقَاتِه ، فَقَدْ عُرِفَتْ حَالُهُ"

(۱) لسان المیزان: ۷/۲۸۲، و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال: ۲۳۳

(۲) کتاب الثقات: ۷/۹۰

ترجمہ: اس حدیث کو ابن القطان نے یہ کہہ کر معلول قرار دیا ہے کہ اس کی سند میں صالح بن ابی عریب راوی ہے جس کا حال معلوم نہیں اور یہ کہ اس سے سوائے عبدالحمید کے کوئی روایت نہیں کرتا؛ مگر ابن القطان نے ان دونوں باتوں میں غلطی کی ہے، پہلی بات میں اس لیے کہ ابن حبان نے اس راوی کا ذکر اپنی کتاب "الثقات" میں کیا ہے؛ لہٰذا اس کا حال معلوم ہوگیا۔ (۱)

دیکھیے کہ علامہ ابن الملقن نے امام ابن القطان کی یہ بات کہ صالح مجہول الوصف ہے، کس طرح یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

نیز ایک اور جگہ ایک راوی مزاحم بن ابی مزاحم کا ذکر کیا ہے جسے ابن القطان نے مجہول قرار دیا اور یہ کہا کہ "لا یعرف له حال" (کہ اس کا حال معلوم نہیں) پھر اس کا رد اس طرح کیا کہ

" قلتُ : بلَى ذكره ابن حبَان فِي " ثقاته " .

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ کیوں معروف نہیں؟ ان کا تو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (۲)

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے "تعجیل المنفعة" میں عبدالاعلی التیمی کے ترجمے میں امام الحسینی کا ان کے بارے میں یہ قول ذکر کر کے "فيه جهالة" (یہ مجہول ہیں) اس کے جواب میں کہا کہ

"قلت : بل هو معروف ، روى عنه أبو حنيفة في الآثار و مسعر ، وذكره البخاري في تاريخه فلم يذكر فيه جرحاً ، و ذكره ابن حبان في الثقات ."

(۱) البدر المنير: ۵/۱۸۹

(۲) البدر المنير: ۶/۱۰۰،

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ؛ بل کہ وہ معروف ہیں: ان سے ابو حنیفہ نے ''کتاب الآثار'' میں اور مسعر نے روایت کیا ہے اور بخاری نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا؛ مگر کوئی جرح ذکر نہیں کی ہے اور ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (۱)

یعنی ابن حبان کا ثقات میں ذکر کر دینا ان کے نزدیک کسی راوی کی جہالت وصف ختم ہونے کے لیے کافی ہے۔

اہل علم کے لیے ایک اہم فائدہ

اہلِ علم کے افادہ کے لیے یہاں یہ بات عرض کرنا مناسب ہے کہ امام ابن حبان نے بہت سے ان رواۃ کی توثیق کی ہے جن سے ایک ہی راوی نے روایت کی ہے اور ان رواۃ کی بھی توثیق کی ہے جن کی کسی اور امام نے توثیق نہیں کی ہے۔ اس صورت میں ابن حبان کی توثیق کب قابل لحاظ ہوگی اور کب نہیں؟ حضرات علمائے محدثین کے نزدیک یہ ایک اہم بحث ہے۔ اس کے بارے میں علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنے عظیم استاذ علامہ عراقی رحمہ اللہ سے چند اور سوالات کے ساتھ اس کے بارے میں بھی بذریعے خط سوال کیا اور اس کا جواب علامہ عراقی نے دیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے سوالات اور علامہ عراقی رحمہ اللہ کے جوابات " أجوبة الحافظ ابن حجر علی أسئلة بعض تلامذته "کے اخیر میں منسلک ہیں، یہ علم حدیث کے شائقین و طالبین کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے، ہم یہاں صرف ابن حبان کی توثیق کے بارے میں سوال و جواب نقل کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا ابن حبان کی توثیق کے سلسلے میں سوال یہ تھا کہ

''ما تقول سیدي في أبي حاتم بن حبان إذا انفرد بتوثیق

---

(۱) تعجیل المنفعة: ۱/۸۱۷

رجل لا يُعرَفُ حالُه إلا من جهة توثيقه له ، هل ينهض توثيقه بالرجل إلى درجة من يُحتَجُّ به ؟ وإذا ذكر ذلك الرجل بعينه أحد الحفاظ كأبي حاتم الرازى بالجهالة ، هل يرفع عنه توثيق ابن حبان له وحده أم لا ؟

ترجمہ: اے میرے سردار! آپ ابو حاتم بن حبان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جب وہ کسی ایسے راوی کی توثیق میں متفرد ہوں جس کا حال سوائے ابن حبان کی توثیق کے کسی اور ذریعے سے معلوم نہ ہو، تو کیا ان کی توثیق آدمی کو اس شخص کے درجے میں کھڑا کرسکتی ہے جس سے حجت لی جاتی ہے؟ اور اگر کوئی اور محدث جیسے ابو حاتم رازی بعینہ اسی راوی کو جہالت سے ذکر کرے تو کیا تنہا ابن حبان کی توثیق اس راوی سے جہالت اٹھاسکتی ہے؟۔

اس کا جواب علامہ عراقی رحمۃ اللہ نے یہ دیا ہے

"الجواب:إن الذين انفرد ابن حبان بتوثيقهم لا يخلو:إما أن يكون الواحد منهم لم يرو عنه إلا راو واحد أو روى عنه اثنان ثقتان و أكثر ، بحيث ارتفعت عنه جهالة عينه ، فإن كان روى عنه اثنان فأكثر، و وثقه ابن حبان ، و لم تجد لغيره فيه جرحاً، فهو ممن يُحْتَجُّ به ، وإن وجدنا لغيره فيه جرحاً مُفَسَّراً ، فالجرح مقدّم.................. ، فأما من وثقهم ولا يعرف لواحد منهم إلا راو واحد ، فقد ذكر ابن القطان في "كتاب بيان الوهم والإيهام :أن من لم يرو عنه إلا واحد ، و وثق فإنه تزول جهالته بذلك."

ترجمہ: جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کی ابن حبان نے توثیق کی ہے

وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس راوی سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی راوی ہوگا یا اس سے دو یا زیادہ ثقہ راوی روایت کرنے والے ہوں گے اس طرح کہ اس سے جہالت ذات مرتفع ہوجائے۔ پس اگر اس سے دو یا زیادہ راوی روایت کرنے والے ہوں اور ابن حبان نے اس راوی کی توثیق کی ہو اور کسی دوسرے محدث سے اس راوی کی کوئی جرح نہ پائی جائے تو یہ راوی قابل احتجاج راویوں میں سے ہے۔ اور اگر ہم اس راوی کے بارے میں دوسرے کسی امام کی طرف سے جرح مفسر پائیں تو پھر جرح توثیق پر مقدم ہے ....رہے وہ راوی جن کی توثیق ابن حبان نے کی ہے اور ان سے صرف ایک ہی راوی روایت کرنے والا معلوم ہو، تو امام ابن القطان نے "کتاب الوھم والإیھام" میں ذکر کیا ہے کہ جس راوی سے صرف ایک ہی راوی روایت کرنے والا ہو اور اس کی توثیق کی گئی ہو، تو اس سے جہالت مرتفع ہوجاتی ہے۔(۱)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ عبد الرحمٰن بن العلاء جن سے دو راویوں نے روایت کی ہے اور کسی اور محدث نے ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، یہ لائق احتجاج ہیں۔ اور اگر شیخ البانی کے بقول ان سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی راوی ہو تب بھی امام ابن حبان کی توثیق کے بعد بقول ابن القطان ان کی جہالت مرتفع ہوجاتی ہے۔

الغرض عبد الرحمٰن بن العلاء سے جہالت ذات و جہالت وصف دونوں ختم ہوکر وہ لائق اعتبار ہوئے، اس لیے ان کی یہ حدیث صحیح یا کم از کم حسن ہوگی، اسی وجہ سے علامہ نیموی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔

اور یہ بھی سنتے چلیے کہ شیخ البانی نے خود ایک حدیث کو جس کی سند بھی وہی ہے جو اوپر

(۱) أجوبة الحافظ ابن حجر :۱۴۱-۱۳۶

کی حدیث کی ہے، اس کو صحیح قرار دیا ہے، چناں چہ صحیح الترمذی میں اسی سند سے آئی ہوئی ایک حدیث کو البانی صاحب نے صحیح لکھا ہے۔(۱)

دوسری دلیل

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

« اقْرَءُوا (يسٓ) عَلَى مَوْتَاكُمْ »

ترجمہ: اپنے مُردوں پر سورہ ''یسٓ'' پڑھو۔(۲)

یہ حدیث اگر چہ کہ ضعیف ہے؛ کیوں کہ اس کی سند میں دوراوی مجہول ہیں ایک ابوعثمان اور دوسرے ان کے باپ جن سے ابوعثمان نے روایت کیا ہے؛ مگر ضعیف حدیث فضائل کے باب میں معتبر ہوتی ہے اور اس سے جو یہ معلوم ہورہا ہے کہ مُردوں پر سورہ ''یس'' پڑھ سکتے ہیں، یہ عمل کوئی واجب ہونے کے لحاظ سے نہیں؛ بل کہ ایک فضیلت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس کو پڑھ کر مُردوں کو ثواب پہنچانے کا جواز اس سے ثابت ہوتا ہے۔

فائدہ: اس حدیث کے بارے میں علامہ ابن حبان اور علامہ ابن القیم کی رائے یہ ہے کہ یہ سورہ یٰس پڑھنے کی بات مُردوں کے لیے نہیں؛ بل کہ محتضر یعنی سکرات میں مبتلا آدمی کے لیے فرمایا گیا ہے؛ لیکن علامہ محبّ طبری اور علامہ ابن الملقن نے امام ابن حبان کی یہ بات نقل کر کے اس پر رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ: یہ بات مسلم نہیں کہ اس سے سکرات میں مبتلا مراد ہے؛ بل کہ سورہ یٰس کا پڑھنا سکرات والے اور میت دونوں کو بھی نفع دیتا ہے۔(۳)

اور علامہ شوکانی نے بھی اس پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ: موتی کا لفظ تو حقیقت میں

---

(۱) صحیح الترمذي: ۱/۵۰۲

(۲) سنن کبری نسائي: ۱۰۸۴۶، أبو داود ۱۲۲۳، أحمد: ۲۰۳۱۶، ابن حبان: ۳۰۰۲، أبو داود طیالسي: ۹۷۳، معجم طبراني کبیر: ۱۶۹۰۴

(۳) البدر المنیر: ۵/۱۹۲

مرے ہوئے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لہذا اس لفظ کو بغیر قرینے کے اپنے اس حقیقی معنی سے ہٹا کر مجازی معنی پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔(۱)

تیسری دلیل

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ

«إِذَا مَاتَ أَحَدُكُمْ فَلا تَحْبِسُوهُ وَأَسْرِعُوا بِهِ إِلَى قَبْرِهِ وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ، وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ فِي قَبْرِهِ.»

ترجمہ: جب تم میں سے کسی کی موت ہو جائے تو اس کو دیر تک نہ رکھو اور اس کی قبر کی جانب اس کو جلدی سے لے جاؤ اور قبر میں رکھ کر اس کے سر کے پاس سورہ فاتحہ اور پیروں کے پاس سورہ بقرہ کا اخیر حصہ تلاوت کیا جائے۔(۲)

اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں طبرانی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور اس کی سند کو حسن کہا ہے۔(۳)

انتباہ:

اس حدیثِ طبرانی وشعب الایمان میں ''سرہانے سورہ فاتحہ'' پڑھنے کا حکم ہے جب کہ خلال کی ''الأمر بالمعروف'' اور ''القراء ۃ عند القبور'' میں ''سرہانے سورہ بقرہ کا اول'' پڑھنے کا حکم ہے۔ راقم کہتا ہے کہ: اوپر ذکر کردہ علاء بن اللجلاج کی مرفوع حدیث

(۱) نیل الأوطار:۵/۲۳

(۲) طبراني:۱۳۶۳۸،شعب الإیمان:۸۸۵۴، کنز العمال:۴۲۳۹۰،الأمر بالمعروف للخلال:۲۴۵،القراء ۃ عند القبور للخلال:۲

(۳) فتح الباري:۳/۱۸۴

میں اور اس کے بعد آنے والی ابن عمر کی ایک موقوف حدیث میں یہ ہے کہ ''سرہانے سورۂ بقرہ کا اول و اخیر پڑھا جائے'' اس لیے اغلب یہ ہے کہ اس روایت کے زیر بحث میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ذکر کسی راوی کی خطا کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

راوی حدیث یحی بن عبداللہ البابلتی پر کلام

راقم کہتا ہے کہ اس حدیث کی سند میں دو راویوں پر کلام کیا گیا ہے: ایک یحی بن عبد اللہ البابلتی، دوسرے ان کے شیخ ایوب بن نھیک۔

جہاں تک یحی بن عبداللہ البابلتی کا تعلق ہے، بہت سے علما حدیث نے بے شک ان کو ضعیف قرار دیا ہے، جیسے امام ابو حاتم نے کہا کہ: قابل شمار نہیں۔ امام ابو زرعہ وغیرہ نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابن عدی نے فرمایا کہ: اس کی احادیث پر ضعف کا اثر واضح ہے۔(۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے بارے میں ائمہ حدیث کے یہاں جس طرح ایک رائے تضعیف کی ملتی ہے دوسری رائے اس کے خلاف ان کی توثیق کی بھی ملتی ہے۔

چناں چہ امام الخلیلی نے ''**الإرشاد في معرفة علماء الحديث**'' میں صاف لکھا ہے کہ

> **''شيخ مَشهُور أكثر عن الأوزاعي، وطعنوا في سماعه منه، منهم من يحسن القول فيه، و منهم من يضعفه''.**

> ترجمہ: یہ مشہور شیخ ہیں، امام اوزاعی سے کثرت سے روایت کرتے ہیں اور علما نے ان کے امام اوزاعی سے سماع کے بارے میں نکیر کی ہے، بعض علماء وہ ہیں جو ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔(۲)

---

(۱) الكامل لابن عدي:۹/۱۱۹، تهذيب الكمال:۳۱/۴۱۲

(۲) الارشاد:۲/۴۶۸

اور امام شمس الدین ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں ان کا تذکرہ بڑے بلند الفاظ میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''الشیخ العالم المحدث أبو سعید یحیی بن عبد اللّٰہ بن الضحاک البابلتي وَهُوَ مِمَّنْ تَجُوْزُ رِوَایَةُ حَدِیْثِهِ''

ترجمہ: شیخ عالم محدث ابو سعید یحی بن عبد اللہ بن الضحاک بابلتی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے حدیث کی روایت کرنا جائز ہے۔(۱)

اور حافظ ابن حجر نے '' لسان المیزان '' میں ان کے بارے میں جو لکھا وہ یہ ہے کہ ''فیه لین''(۲)

اور یہ بہت ہلکی و معمولی جرح ہے، اس سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ نہ متفق علیہ ضعیف ہیں اور نہ ان کا ضعف شدید ہے؛ بل کہ جیسا کہ اصول حدیث سے واقف کاروں پر واضح ہے کہ یہ سب سے ہلکی جرح ہے اور جس کے بارے میں یہ کہا جائے، اس کے بارے میں امام دارقطنی نے کہا کہ ایسا راوی متروک و ساقط نہیں ہوتا؛ بل کہ ایسی جرح سے مجروح ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی عدالت ساقط نہیں ہوتی۔(۳)

اس ساری تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یحی بن عبد اللہ البابلتی کے بارے میں ایک تو علمائے حدیث کی آراء میں اختلاف ہے، ان کی توثیق کرنے والے بھی ہیں اور تضعیف کرنے والے بھی۔ دوسرے یہ کہ ان میں اگر ضعف پایا بھی جاتا ہے تو وہ معمولی ضعف ہے، جس سے راوی کی عدالت ساقط نہیں ہوتی اور ایسا راوی کم از کم حسن الحدیث ہو سکتا ہے۔

راوی ایوب بن نہیک پر کلام

اب رہے ایوب بن نہیک، تو ابو حاتم وغیرہ نے ان کی تضعیف کی ہے اور ابو زرعہ

---

(۱) سیر أعلام النبلاء: ۱۰/۳۲۰

(۲) لسان المیزان: ۷/۴۳۴

(۳) المقنع: ۲۸۶، المنهل الروي: ۸۵

نے منکر الحدیث کہا ہے؛ لیکن ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا اور کہا کہ خطا کرتے ہیں۔(۱)

اور امام بخاری رحمۃ اللہ نے ان کا تذکرہ اپنی "التاریخ الکبیر" میں کیا ہے؛ مگر ان پر کوئی جرح ذکر نہیں فرمائی ہے۔(۲)

اور امام بخاری رحمۃ اللہ کا اپنی تاریخ میں کسی راوی کا ذکر کر کے کوئی جرح نہ کرنا اس کی توثیق کی جانب اشارہ سمجھا جاتا ہے۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ نے "**تعجیل المنفعة**" میں متعدد مواقع پر رواۃ کی توثیق پر اس سے استدلال کیا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے ان کا ذکر بلا جرح کیا ہے۔

مثلاً عبد اللہ بن عباد الانصاری (۱/۴۵ے) عبد الاعلی التیمی (۱/۸۱ے) کریب بن الحارث: (۲/۱۵۶) ان سب کے تراجم میں فرمایا کہ

"**و ذكره البخاري ، فلم يذكر فيه جرحاً**".

ترجمہ: امام بخاری نے اس کا ذکر تو کیا ہے؛ مگر اس پر کوئی جرح ذکر نہیں کی۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے بھی "**زاد المعاد**" میں علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمۃ اللہ سے یہ اصول نقل کیا ہے، وہ ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"**وَقَدْ أَعَلَّهُ الْبَيْهَقِيّ بِانْقِطَاعِهِ وَتَضْعِيفِهِ عِكْرِمَةَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ قَالَ أَبُو الْبَرَكَاتِ بْنُ تَيْمِيَّةَ:وَيُمْكِنُ الْمُطَالَبَةُ بِسَبَبِ الضَّعْفِ فَإِنَّ الْبُخَارِيّ ذَكَرَهُ فِي "تَارِيخِهِ" وَلَمْ يَطْعَنْ فِيهِ ، وَعَادَتُهُ ذِكْرُ الْجَرْحِ وَالْمَجْرُوحِينَ .**"

ترجمہ: اس کو امام بیہقی رحمۃ اللہ نے انقطاع اور اس کے راوی

(۱) میزان الاعتدال:۱/۲۹۴،لسان المیزان:۲/۲۵۷

(۲) دیکھو:التاریخ الکبیر:۱/۴۲۵

عکرمہ بن ابراہیم کی تضعیف کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے، ابو البرکات بن تیمیہ نے فرمایا کہ ان سے ان کے ضعیف ہونے کا سبب پوچھا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ امام بخاری نے اس کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور اس پر کوئی طعن نہیں کیا حالاں کہ ان کی عادت ہے کہ وہ جرح و مجروحین کا ذکر کرتے ہیں۔ (۱)

لہذا ایوب بن نہیک کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی مختلف فیہ راوی ہیں جن کے بارے میں بہت سے ائمہ حدیث نے ضعیف ہونے کا حکم لگایا ہے؛ مگر امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ان پر کوئی جرح نہ کر کے اپنے نزدیک ثقہ ہونے کا اشارہ دیا ہے، اسی طرح امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے تو ان کے نزدیک بھی یہ ثقہ ہیں۔ اس وجہ سے یہ بھی حسن الحدیث ہیں۔

اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امام ابن حجر رحمۃ اللہ نے اس حدیث کی سند کو " فتح الباري " میں حسن کیوں قرار دیا ہے؟ جیسا کہ اوپر اس کا حوالہ پیش کیا گیا ہے۔

الغرض یہ دو راوی جن پر کلام ہوا ہے دونوں حسن الحدیث کے درجے کے ہیں، اس لیے ان کی حدیث حسن ہے۔ واللہ اعلم۔

ان دونوں احادیث کا مفاد یہ ہے کہ تلاوت قرآن سے نفع ہوتا ہے، اس لیے یہ فرمایا گیا کہ دفن کے وقت سرہانے سورہ بقرہ کا شروع اور اخیر حصہ پڑھا جائے؛ جیسا کہ حضرت علاء بن اللجلاج کی روایت میں ہے، یا سرہانے سورہ فاتحہ اور پائنتی سورہ بقرہ کا اخیر حصہ تلاوت کیا جائے، جیسے کہ ابن عمر کی روایت میں ہے۔ ان دونوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے اور خود اس پر عمل کرنے کے لیے اس کی وصیت بھی کی ہے۔

---

(۱) زاد المعاد: ۱/۴۷۱

چوتھی دلیل

حضرت علاء بن اللجلاج سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے صاحب زادوں سے فرمایا کہ

" إِذَا أَدْخَلْتُمُونِي قَبْرِي فَضَعُونِي فِي اللَّحْدِ وَقُولُوا بِاسْمِ اللَّهِ وَعَلَىٰ سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَسُنُّوا عَلَيَّ التُّرَابَ سَنًّا ، وَاقْرَءُ وا عِنْدَ رَأْسِي أَوَّلَ الْبَقَرَةِ وَخَاتِمَتَهَا فَإِنِّي رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَسْتَحِبُّ ذَلِكَ."

(جب تم مجھے میری قبر میں داخل کردو اور لحد میں رکھدو تو "بسم اللہ وعلی سنۃ رسول اللہ ﷺ" کہو اور مجھ پر آہستہ سے مٹی ڈالو اور میرے سرہانے سورہ بقرہ کا شروع اور اخیر حصہ پڑھو؛ کیوں کہ میں نے حضرت ابن عمر کو دیکھا کہ وہ اس کو مستحب سمجھتے تھے)(۱)

یہ حدیثِ صحابی حضرت علاء بن اللجلاج پر موقوف ہے جس میں صحابی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا دفن کے بعد سورہ بقرہ کا اول وآخر پڑھنے کو پسند کرنا اور حضرت علاء بن اللجلاج کا اس کی وصیت کرنا نقل ہوا ہے۔

اس کی سند میں وہی عبد الرحمن بن العلاء ہیں جن پر مفصل کلام ہم نے اوپر کردیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ مجہول نہیں ہیں اور ان کی حدیث سند کے لحاظ سے حسن ہے؛ لہذا اس حدیث کی سند بھی درجہ حسن سے کم نہیں ہے۔ چناں چہ علامہ نووی نے "الأذكار" میں اس کی سند کو حسن کہا ہے اور علامہ ابن حجر نے "الأذكار" کی تخریج "نتائج الأفكار" میں اس کی تصدیق کرتے ہوئے اس کو "موقوف حسن" قرار دیا ہے۔(۲)

---

(۱) سنن كبرى بيهقي مع الجوهر النقي:۴/۵۶

(۲) دیکھو: الأذكار:۱۳۷، و نتائج الأفكار:۴/۴۲۶

اور یہ حدیث اگر چہ کہ موقوف علی الصحابی ہے؛ مگر حکماً مرفوع ہے؛ کیوں کہ صحابہ کے وہ اقوال وافعال جس کا مصدر قیاس واجتہاد نہیں ہوسکتے وہ مرفوع کے حکم میں ہوتے ہیں، جیسا کہ یہ اصول کتب اصول میں مصرح ہے؛ لہذا یہ حدیث بھی مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی اسی کو فرماتے ہیں کہ "یہ موقوف حدیث مرفوع کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ یہ عقل سے معلوم ہونے والی باتوں میں سے نہیں ہے"(۱)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ دفن کے وقت قرآن پاک کی تلاوت نفع بخش ہوتی ہے اور وہ نفع ثواب کا ملنا ہے۔

تلاوت سے ایصال ثواب پر مزید دلائل

تلاوت قرآن سے ایصالِ ثواب کے یہ دلائل تو وہ تھے جن میں صراحت ہے کہ اس سے اموات کو نفع وثواب پہنچتا ہے، یہاں چند اور دلائل ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے صراحت سے تو نہیں اشارۃً یہی بات ثابت ہوتی ہے اور ان احادیث سے یہ اشارہ بڑے بڑے حضرات ائمہ کرام وعلمائے عظام نے سمجھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

مرَّ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ ؛ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ ، وَأَمَّا الآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ ثُمَّ أَخَذَ جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا نِصْفَيْنِ فَغَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوا :يَا رَسُولَ اللهِ! لِمَ فَعَلْتَ هَذَا ؟ قَالَ لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا .

ترجمہ: ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں پر

(۱) إعلاء السنن: ۳۴۲/۸

سے ہوا، آپ نے فرمایا کہ: ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور انھیں کسی بڑی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا ہے؛ بل کہ ایک کو اس وجہ سے کہ وہ پیشاب سے بچتا نہیں تھا، دوسرے کو اس لیے کہ وہ چغلی کھاتا تھا۔ پھر آپ نے ایک تر و تازہ ٹہنی لی اور اس کو دو برابر حصوں میں چیر ڈالا اور ہر قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا، صحابہ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں فرمایا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ: ممکن ہے کہ اس کا عذاب ان کے تر و تازہ رہنے تک کم کر دیا جائے۔ (۱)

اس حدیث کے معنی تو واضح ہیں، اس میں جو آیا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درخت کی ایک شاخ لے کر دونوں قبروں پر گاڑ دیا اور دریافت کرنے پر فرمایا کہ "ممکن ہے کہ جب تک یہ سوکھ نہ جائیں ان قبر والوں کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی"، تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تخفیف عذاب کا سبب کیا ہے؟

اس کے بارے میں علمائے کرام نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں، ایک یہ کہ یہ تخفیف اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے ہے، بعض نے کہا کہ اس کا سبب اللہ کے نبی کی دعا ہے، ایک وجہ و سبب اس کا بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ درخت کی ٹہنی و شاخ جب تک تر و تازہ رہتی ہے اللہ کا ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہے، یہی تسبیح و ذکر ان اہل قبر کے حق میں تخفیف عذاب کا سبب ہے۔ (۲)

اس توجیہ کے پیشِ نظر بعض اکابر علما نے اس سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ قبر کے پاس تلاوت کرنے سے مرحومین کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے؛ کیوں کہ جب ایک بے جان ٹہنی کی تسبیح سے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو انسان کی تسبیح و تلاوت سے تو بدرجہ اولیٰ نفع پہنچنا چاہیے۔

---

(۱) بخاري:۲۱۸، مسلم:۷۰۳، نسائي:۲۰۶۹، مسند أحمد:۱۹۸۰

(۲) دیکھو: فتح الباري:۱/۳۲۰، عمدة القاري:۶/۴

تلاوتِ قرآن سے ایصالِ ثواب پر حدیث مذکور سے استنباط

یہ استنباط متعدد حضرات نے کیا اور اس کو بہت سے علما نے اختیار کیا ہے، جیسے امام محی السنۃ البغوی، امام ابن دقیق العید، شارح مسلم امام قرطبی، محدث عظیم علامہ محی الدین نووی، شارح بخاری علامہ بدر الدین العینی، علامہ جلال الدین سیوطی اور علامہ محمد عابد سندھی رحمہم اللہ وغیرہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات کوئی معمولی درجے کے لوگ نہیں تھے؛ بل کہ آسمان علم کے آفتاب ومہتاب اور حدیث وفقہ کے روشن ستارے تھے، ان کا اس کو قبول کرنا بے معنیٰ بات نہیں ہوسکتی۔ یہاں ان اکابر علما کے چند ایک حوالے درج کرتا ہوں:

چناں چہ امام محی السنۃ البغوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

”وفیه دلیل علی أنه یستحب قراء ة القرآن علی القبور؛ لأنه أعظم من کل شيء برکةً وثواباً“

ترجمہ: اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ قبروں پر تلاوت مستحب ہے؛ کیوں کہ یہ تمام چیزوں میں سب سے زیادہ برکت وثواب کی چیز ہے۔(۱)

امام ابن دقیق العید القشیری اپنی کتاب **”إحکام الأحکام شرح عمدة الأحکام“** میں اسی حدیث سے مستنبط مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

” أخذ بعض العلماء من هذا: أن المیت ینتفع بقراء ة القرآن علی قبره من حیث إن المعنی الذي ذکرناه في التخفیف عن صاحبي القبرین هو تسبیح النبات ما دام رطباً فقراء ة القرآن من الإنسان أولی بذلک“

ترجمہ: بعض علما نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ میت، قبر پر قراءت قرآن

(۱) شرح السنة للبغوی: ۱/۳۷۲

سے منتفع ہوتی ہے، اس طرح کہ جو سبب ہم نے قبر والوں سے تخفیف عذاب کا بیان کیا ہے وہ نباتات کے تروتازہ رہنے تک ان کی تسبیح کرنا ہے، لہذا انسان کا قرآن پڑھنے سے یہ بات حاصل ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا۔(۱)

امام محی الدین نووی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ

" وَاسْتَحَبَّ الْعُلَمَاء قِرَاءَة الْقُرْآن عِنْد الْقَبْر لِهَذَا الْحَدِيث ؛ لِأَنَّهُ إِذَا كَانَ يُرْجَى التَّخْفِيف بِتَسْبِيحِ الْجَرِيد فَتِلَاوَة الْقُرْآن أَوْلَى ، وَاللَّهُ أَعْلَم.

ترجمہ: حضرات علما نے اسی حدیث کی وجہ سے قبر پر قرآن کی تلاوت کو مستحب قرار دیا ہے؛ کیوں کہ جب ایک درخت کی شاخ کی تسبیح سے عذاب میں تخفیف کی امید ہو سکتی ہے تو قرآن کی تلاوت سے تو بدرجہ اولی ہونا چاہیے۔(۲)

امام قرطبی رحمۃ اللہ نے "المفهم شرح مسلم" میں لکھا ہے کہ

" و أخذ من هذا التأويل جواز القراءة والذكر على القبور"

ترجمہ: اس توجیہ سے قبروں پر قراءت قرآن اور ذکر کا جواز اخذ کیا گیا ہے۔(۳)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے "الامتاع بالأربعين المتباينة السماع" میں لکھا ہے کہ

" وأصل ذلک وضع الجريدتين في القبر ، بناء على أن فائدتهما أنهما ما دامتا رطبتين تسبحان ؛ فتحصل البركة

(۱) إحكام الأحكام:۱/۴۸

(۲) شرح مسلم:۱/۱۴۱

(۳) المفهم شرح مسلم:۴/۲۸

بتسبيحهما لصاحب القبر ، ولهذا جعل غاية التخفيف جفافهما ، وهذا على بعض التأويلات في ذلك . وإذا حصلت البركة بتسبيح الجمادات فبالقرآن الذي هو أشرف الذكر من الآدمي الذي هو أشرف الحيوان أولى بحصول البركة بقراء ته ؛ ولا سيما إن كان القارئ رجلاً صالحاً. " واللہ أعلم

ترجمہ: اس کی اصل قبر پر دوشاخوں کا اس بنا پر گاڑنا ہے کہ ان کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب تک یہ تروتازہ رہیں گی تسبیح کرتی رہیں گی، پس ان کی تسبیح سے قبر والے کو برکت حاصل ہوگی۔ اور اللہ کے رسول نے اسی لیے شاخوں کے سوکھ جانے کو تخفیف عذاب کی غایت قرار دیا ہے۔ یہ اس حدیث کی متعدد تاویلات میں سے ایک تاویل کی بنا پر ہے۔ پس جب جمادات کی تسبیح سے برکت حاصل ہوسکتی ہے تو قرآن کریم - جو کہ اشرف الذکر ہے- اس کی تلاوت انسان کی جانب سے ہو- جو کہ اشرف المخلوق ہے-تو حصول برکت بدرجہ اولی ہوگی، بالخصوص اگر قاری نیک وصالح شخص ہو۔(۱)

علامہ عینی نے شرح ابوداود میں اس حدیث سے مستنبط مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"الرابعة:إثبات انتفاع الميت بتسبيح غيره، ولهذا استحب العلماء قراء ة القرآن عند القبر؛ لأنه إذا كان يُرجى التخفيف لتسبيح الجريد، فبتلاوة القرآن أولى."

ترجمہ: اس حدیث سے چوتھا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ: میت کو دوسروں کی تسبیح سے نفع ہوتا ہے اور اسی لیے علما نے قبر کے پاس قرآن کی

(۱) الإمتاع بالأربعين المتباينة السماع:۸۲

تلاوت کو مستحب قرار دیا ہے؛ کیوں کہ جب ایک درخت کی شاخ کی تسبیح سے عذاب میں تخفیف کی امید ہوسکتی ہے تو قرآن کی تلاوت سے تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔(۱)

اور علامہ سیوطی و علامہ سندھی رحمہما اللہ نے نسائی کی شرح میں لکھا ہے:

”قِيلَ الْمَعْنَى فِيهِ أَنَّهُ يُسَبِّح مَا دَامَ رَطْبًا فَيَحْصُل التَّخْفِيف بِبَرَكَةِ التَّسْبِيح ، وَعَلَى هَذَا فَيَطَّرِد فِي كُلّ مَا فِيهِ رُطُوبَة مِنْ الْأَشْجَار وَغَيْرهَا ، وَكَذَلِكَ مَا فِيهِ بَرَكَة كَالذِّكْرِ وَتِلَاوَة الْقُرْآن مِنْ بَاب أَوْلَى“

ترجمہ: کہا گیا ہے کہ عذاب میں تخفیف کی وجہ یہ ہے کہ جب تک شاخ تازہ رہتی ہے تسبیح کرتی ہے، پس اس تسبیح کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے، پس اس تاویل و توجیہ کی بنا پر یہ بات ہر اس چیز میں جاری ہوگی ؛جس میں تازگی ہو جیسے درخت وغیرہ اور اسی طرح اس چیز میں بھی بدرجہ اولی جاری ہوگی،جس میں برکت ہو، جیسے ذکر اور تلاوت قرآن۔(۲)

ان حضرات اکابر ائمہ و علماء کے ان بیانات سے واضح ہوا کہ انھوں نے اس حدیث سے یہ استنباط کیا ہے کہ قرآن کی تلاوت اور ذکر و اذکار بھی میت کو نفع دیتے ہیں؛ کیوں کہ اگر ایک ٹہنی و شاخ کی تسبیح سے میت کو عذاب میں تخفیف کا فائدہ ہوسکتا ہے تو ایک انسان کی تلاوت و ذکر سے کیوں نہ نفع ہوگا۔ یہ حضرات جن کے حوالے یہاں دیے گئے ہیں، یہ سب معتبر علما ہیں جن پر دنیا کے تمام مسلمان اپنے دینی امور میں اعتماد کرتے ہیں؛ لہذا ان سب کی رائے کے مطابق اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کرنا قرین قیاس ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

---

(۱) شرح أبي داود للعيني:۱/۸۵

(۲) حاشية السيوطي و السندهي على النسائي :۱/۳۰

خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْماً إلٰی سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِیْنَ تُوُفِّيَ ، قَالَ: لَمَّا صَلّٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ ، وَ وُضِعَ فِيْ قَبْرِہ ، وَسُوِّيَ عَلَیْہِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَسَبَّحْنَا طَوِیْلاً ، ثُمَّ کَبَّرَ فَکَبَّرْنَا ، فَقِیْلَ :یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ کَبَّرْتَ ؟ قَالَ:قَدْ تَضَایَقَ عَلٰی ھٰذاَ الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُہٗ حَتّٰی فَرَّجَہُ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ عَنْہُ. “

ترجمہ: ہم ایک دن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت سعد بن معاذ کے یہاں گئے ،جبکہ ان کی وفات ہوئی تھی ، جب آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھادی اوران کوقبر میں رکھ دیا گیا اوران پر مٹی ڈال دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہا اور ہم بھی کافی دیر تک سبحان اللہ پڑھتے رہے، پھر آپ نے اللہ اکبر کہا اور ہم نے بھی اللہ اکبر کہا، پس آپ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! آپ نے پہلے تسبیح پھر تکبیر کیوں کہی؟ تو آپ نے فرمایا کہ: اس نیک صالح بندے پر قبر تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کشادہ فرمادیا۔(۱)

ملا علی قاری نے ”مرقاۃ شرح مشکاۃ“ میں اور علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ”مرعاۃ شرح مشکاۃ“ میں علامہ طیبی سے اس حدیث کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ

”أيْ مَا زِلْتُ أُسَبِّحُ وَ أُکَبِّرُ، وَ تُسَبِّحُوْنَ وَ تُکَبِّرُوْنَ حَتّٰی فَرَّجَہُ اللّٰہُ عَنْہُ“

ترجمہ: یعنی میں برابر تسبیح وتکبیر پڑھتا رہا اور تم بھی برابر تسبیح وتکبیر کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ سے اس تنگی کو

(۱) طبراني:۵۲۰۸،و أحمد:۱۴۹۱۶، المسند الجامع:۲۹۹۰

دور کر کے کشادگی فرمادی۔ (۱)

اس حدیث اور اس کی اس شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل قبور کو زندوں کی تسبیح و تکبیر سے نفع ہوتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے قبر کی تنگی کو کشادگی سے تبدیل فرما دیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اس باب کی موضوع احادیث پر محدثانہ کلام

یہاں بطور افادہ یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ اس سلسلے میں چند احادیث ایسی ہیں جن میں تلاوت کر کے اس کا ثواب مرحومین کو پہنچانے کا ذکر صراحۃً ملتا ہے؛ مگر یہ احادیث محدثین کے اصول پر کیا درجہ رکھتی ہیں، یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اہل علم کے افادے کے لیے اس سلسلہ میں کلام کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

❁ پہلی حدیث

حضرت ابو بکر صدیق سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

«مَنْ زَارَ قَبْرَ وَالِدَیْهِ کُلَّ جُمُعَةٍ ، فَقَرَأَ عِنْدَهُمَا أَوْ عِنْدَهُ "یٰسٓ" غُفِرَ لَهُ بِعَدَدِ کُلِّ آیَةٍ أَوْ حَرْفٍ .»

ترجمہ: جو شخص ہر جمعہ اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے اور ان دونوں کے پاس یا ان میں سے ایک کے پاس سورہ "یٰس" پڑھے تو اس کو ہر ہر آیت کے برابر یا ہر ہر حرف کے برابر گناہوں کی بخشش ہوگی۔ (۲)

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح :۱/۴۷۸، مرعاۃ المفاتیح:۱/۲۳۱

(۲) رواہ أبو بکر النجار کذا في عمدۃ القاري:۳/۱۷۶، و الفتاوی الحدیثیة للسخاوي:۱۹۲

مذکورہ حدیث موضوع ہے

اس روایت کو متعدد حضرات محدثین نے موضوع قرار دیا ہے، چناں چہ علامہ ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں داخل کیا ہے، اور امام ابن عدی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں اور اس کا راوی عمرو بن زیاد متہم بالوضع ہے اور امام دار قطنی سے نقل کیا کہ یہ راوی حدیث گھڑتا تھا۔ امام ابن عدی نے کہا یہ سند باطل ہے ، جس کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح علامہ ذہبی، علامہ سخاوی، علامہ شوکانی اور بعد میں شیخ البانی نے بھی اس کو موضوع کہا ہے۔ (۱)

مگر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے "اللآلي المصنوعة" میں ایک ضعیف حدیث کو اس کی شاہد کے طور پر پیش کیا ہے، اگر چہ کہ شواہدات میں ضعیف چل جاتی ہے؛ مگر علامہ سیوطی نے جس روایت کا ذکر کیا ہے اس میں صرف جمعہ میں والدین کی قبر کی زیارت کا ذکر ہے، تلاوت کا ذکر نہیں، لہذا یہ روایت اگر شاہد بنے گی تو صرف اس حصہ کی شاہد بنے گی، مگر تلاوت والے حصہ کی شاہد نہیں ہو سکتی بلہذا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ کا علی الاطلاق اس کو اس کا شاہد قرار دینا صحیح نہیں، لہذا وہی بات صحیح ہے جو ابن الجوزی نے لکھی ہے کہ یہ موضوع ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شواہدات کی وجہ سے روایت کو تقویت اس صورت میں ملتی ہے جبکہ کوئی حدیث صرف ضعیف ہو، موضوع حدیث کو اس سے کوئی تقویت نہیں ملتی۔

دوسری حدیث

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"مَنْ مَرَّ عَلَى الْمَقَابِرِ وَقَرَأَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ إِحْدٰى عَشَرَةَ مَرَّةً ،

(۱) دیکھو: الکامل لابن عدي: ۱۵۲/۵، الموضوعات الکبری ، تلخیص الموضوعات للذهبي: ۳۴۶/۱، فتاوى الحديثية ۱۹۳، الفوائد المجموعة: السلسلة الضعيفة :۱/ ۱۲۶

ثُمَّ وَهَبَ أجْرَهُ لِلْأمْوَاتِ اُعْطِيَ مِنَ الْاَجْرِ بِعَدَدِ الْاَمْوَاتِ "

ترجمہ: جو شخص قبرستان سے گذرے اور گیارہ مرتبہ "سورہ قل هو الله احد" پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخش دے تو اس کو مردوں کے اجر کے برابر ثواب عطا کیا جائے گا۔(۱)

حدیث مذکور کی سند پر کلام اور اس کا درجہ

اس حدیث کو امام ابو بکر الخلال نے بہ طریق "عبد الله بن أحمد بن عامر الطائي عن عبد الله بن عامر الطائي ، حدثني أبي ، ثنا علي بن موسى ، عن أبيه ، موسى ، عن أبيه ، جعفر ، عن أبيه ، محمد ، عن أبيه علي ، عن أبيه الحسين ، عن أبيه علي بن أبي طالب "روایت کیا ہے۔

اس سند میں عبداللہ بن احمد بن عامر اور اس کا باپ احمد بن عامر دونوں نا قابل اعتبار ہیں۔عبداللہ بن احمد بن عامر کے بارے میں علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ: یہ ایک من گھڑت نسخہ روایت کرتا تھا جو علی رضاء کے واسطے سے ان کے آباء سے نقل کیا جاتا ہے، یہ خود اس کا یا اس کے باپ کا وضع کردہ ہے۔(۲)

اسی سے اس کے باپ کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بھی متہم بالکذب ہے،"الحثیث" میں ابن الجوزی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس کی روایت کردہ ایک حدیث کے بارے میں کہا کہ یہی محل تہمت ہے۔اسی طرح فضیلت عباس میں ایک حدیث کے

---

(۱) فضائل سورة الإخلاص للخلال رقم:۵۴، و فضائل القرآن للمستغفري بتحقيق الدكتور أحمد بن فارس السلوم:۱۰۷۵

(۲) ميزان الاعتدال:۲/۳۹۰،لسان الميزان:۳/۲۵۲

بارے میں کہا کہ اس کو گھڑنے میں عبداللہ یا اس کا باپ متہم ہے۔(۱)

لہٰذا یہ طریق موضوع ہے اور اس کی ایک متابعت امام مستغفری نے فضائل القرآن میں ذکر کی ہے، چناں چہ امام مستغفری نے اسے بطریق ''داود بن سلیمان الغازی عن علی بن موسیٰ الخ روایت کیا ہے اور یہ طریق بھی موضوع ہے؛ کیوں کہ اس ''داود بن سلیمان الغازی'' کے بارے میں علامہ ذہبی نے ''میزان'' اور ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں لکھا ہے کہ

'' كذبه يحيى بن معين، ولم يعرفه أبو حاتم، و بكل حال فهو شيخ كذاب، له نسخة موضوعة على الرضا.''

ترجمہ: اس کو یحیٰ بن معین نے جھوٹا قرار دیا ہے اور ابو حاتم نے اس کو مجہول کہا ہے اور ہر صورت میں یہ شیخ کذاب ہے، اس کے پاس ایک نسخہ حضرت امام علی رضا پر گھڑا ہوا موجود تھا۔(۲)

لہٰذا یہ دونوں طریق موضوع ہیں، اس لیے یہ حدیث موضوع ہے۔

تیسری حدیث

امام سعد بن علی زنجانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الفوائد'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

« مَنْ دَخَلَ الْمَقَابِرَ ثُمَّ قَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ وَأَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ثُمَّ قَالَ إِنِّي جَعَلْتُ ثَوَابَ مَا قَرَأْتُ مِنْ كَلَامِكَ لِأَهْلِ الْمَقَابِرِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ كَانُوا شُفَعَاءَ لَهُ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى. »

(جو شخص قبرستان میں داخل ہو، پھر سورہ فاتحہ اور سورہ قل هو الله احد اور

---

(۱) الكشف الحثيث:۴۶

(۲) ميزان الاعتدال: ۸/۲، لسان الميزان: ۴۱۷/۲

سورہ الھاکم التکاثر پڑھے، پھر یوں کہے کہ اے اللہ! میں نے تیرے کلام میں سے جو کچھ پڑھا ہے اس کا ثواب میں نے قبرستان کے مؤمن مردوں اور عورتوں کو بخش دیا تو یہ قبر والے اللہ کی جناب میں اس آدمی کے سفارشی بن جائیں گے۔(۱)

مذکورہ روایت کی تحقیق

اس کی سند کتاب مذکور میں اس طرح ہے

''حدثنا أبو محمد الحسن بن عمرو بن علي بن زريق المقرئ ، نا أبو القاسم عبد الباقي بن بكر بن حديد المالكي ، نا أحمد بن سعيد الإخميمي ، حدثنا أبو الطيب عمران بن موسى العسقلاني من حفظه ، نا المؤمل بن إهاب ، نا عبد الرزاق ، أنبا معمر ، عن الزهري ، عن سعيد بن المسيب ، عن أبي هريرة.''

اس میں متعدد راوی ایسے ہیں جن کا کوئی ذکر کتب اسماء الرجال و تاریخ میں نہیں ملتا، جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور کس قسم کے ہیں؟ چناں چہ ابو محمد الحسن بن عمرو بن علی بن زریق المقرء، ابوالقاسم عبدالباقی بن بکر بن حدید المالکی، احمد بن سعید الاخمیمی، ابوالطیب عمران بن موسیٰ العسقلانی کا کوئی حال واحوال مجھے تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ ہاں اس کے بعد کے سب راوی ثقہ و معروف ائمہ ہیں۔

اس کے علاوہ امام زنجانی کی یہ کتاب ''فوائد'' کے نام سے ہے اور فوائد کے نام سے لکھی جانے والی کتابوں کا عام حال یہ ہے کہ ان کی روایات غریب و منکر ہوتی ہیں؛ کیوں کہ ''فوائد'' محدثین کی اصطلاح میں اس کتاب کا نام ہے جس میں محدث کوئی عجیب و غریب ایسی بات ذکر کرتا ہے جو دوسرے محدثین کے یہاں نہیں ملتی، اس لحاظ سے بھی

(۱) المنتقى من فوائد الزنجاني:۵۸

اندازہ یہ ہے کہ یہ حدیث بھی قابل اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم۔

چوتھی روایت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

”مَنْ دَخَلَ الْمَقَابِرَ، فَقَرَأَ سُوْرَةَ (یٰسٓ) خُفِّفَ عَنْهُمْ يَوْمَئِذٍ، وَكَانَ لَهُ بِعَدَدِ مَنْ فِيْهَا حَسَنَاتٌ.“

ترجمہ: جو شخص قبرستان میں داخل ہو اور سورہ ”یس“ پڑھے تو اس دن قبر والوں سے عذاب میں تخفیف کردی جاتی ہے اور اس شخص کو قبر والوں کی تعداد کے برابر حسنات ملتے ہیں۔(۱)

شیخ ناصر الدین البانی نے لکھا ہے کہ یہ موضوع ہے؛ کیوں کہ اس کی سند میں ایک تو ابو عبیدہ مجہول راوی ہے۔ دوسرے ایک اور راوی ایوب بن مدرک ہے جو ضعیف؛ بل کہ ابن معین کے بقول کذاب ہے، تیسرے احمد الریاحی ہے جو کہ مجہول ہے۔(۲)

موضوع احادیث کا تعدد اصل ہونے کی دلیل ہے

اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ ان احادیث میں سے اکثر تو موضوع ہی ہیں؛ مگر ان میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے، سب کا قدر مشترک ایک ہی ہے، جیسا کہ واضح ہے۔ گویا یہ روایات ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں؛ مگر اس کے باوجود چوں کہ موضوع حدیث کے ایک دوسرے سے ملنے پر ان کو کوئی تقویت نہیں ملتی، اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مجموعہ حسن لغیرہ ہو گیا، البتہ یہاں ایک اصول محدثین کے نزدیک مسلمات میں سے ہے، اس کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے، وہ یہ کہ اگر متعدد موضوع روایات کسی باب میں

---

(۱) رواه أبو بكر النجار، كذا في عمدة القاري:۳/۱۷۶

(۲) سلسلة الأحاديث الضعيفة:۳/۳۹۷

وارد ہوں تو اس سے اس قدر بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ بے اصل بات نہیں۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ نے "تدریب الراوي" میں یہ اصول شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"(وأما الضعيف لفسق الراوي)أو كذبه (فلا يؤثر فيه موافقة غيره)له إذا كان الآخر مثله لقوة الضعف ، وتقاعد هذا الجابر؛ نعم يرتقي بمجموع طرقه عن كونه منكراً ، أو لا أصل له . صرح به شيخ الإسلام ، قال : بل ربما كثرت الطرق حتى أوصلته إلى درجة المستور السيء الحفظ بحيث إذا وجد له طريق آخر فيه ضعفٌ قريبٌ محتمل ارتقى بمجموع ذلك إلى درجة الحسن "

ترجمہ: لیکن جو حدیث راوی کے فسق یا کذب کی وجہ سے ضعیف ہو اس میں دوسرے کی موافقت مؤثر نہیں؛ جب کہ یہ دوسرا بھی پہلے راوی کی طرح فاسق یا کاذب ہو؛ کیوں کہ ضعف قوی اور اس کا جابر کمزور ہے۔ ہاں! البتہ ان متعدد طرق کے مجموعے سے وہ بے اصل اور منکر ہونے سے نکل جائے گی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح کی ہے؛ بل کہ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض اوقات طرق کی کثرت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کو کمزور حافظہ والے مستور راوی کی حدیث کے درجے تک پہنچا دیتی ہے؛ اس طرح کہ اگر اس کا ایک اور معمولی ضعف والا طریق مل جائے تو یہ سب مل کر حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں۔(۱)

یہی بات علامہ سخاوی رحمۃ اللہ "فتح المغيث" میں فرماتے ہیں کہ

"ولكن بكثرة طرقه القاصرة عن درجة الاعتبار بحيث لا

(۱) تدريب الراوي:۱/۱۷۷

يجبر بعضها ببعض يرتقي عن مرتبه المردود المنكر الذي لا يجوز العمل به بحال إلى رتبة الضعيف الذي يجوز العمل به في الفضائل ، و ربما تكون تلك الطرق الواهية بمنزلة الطريق التي فيها ضعف يسير ، بحيث لو فرض مجيء ذلك الحديث بإسناد فيه ضعف يسير كان مرتقياً بها إلى مرتبة الحسن لغيره "

ترجمہ: لیکن درجہ اعتبار سے قاصر وہ طرقِ حدیث جو ایک دوسرے کو تقویت نہیں دے سکتے، ان کی کثرت حدیث کو مردود ومنکر کے درجے سے جس پر عمل کسی بھی حال میں جائز نہیں ہوتا، اس کو ایسی ضعیف حدیث کے درجے تک پہنچا دیتی ہے، جس پر فضائل کے باب میں عمل جائز ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ واہی طرق کا مجموعہ معمولی ضعف والے طریق کے مرتبے میں ہوجاتے ہیں، اس طرح کہ اگر ایک اور ایسی معمولی ضعف والی سند کا آنا فرض کیا جائے تو وہ حسن لغیرہ کے درجے کو پہنچ جائے۔(۱)

علامہ طاہر الجزائری رحمۃ اللہ نے "توجيه النظر" میں لکھا کہ

"قال بعض الحفاظ إن هذا النوع قد تكثر فيه الطرق وإن كانت قاصرة عن درجة الاعتبار ،حتى يرتقيَ عن رتبة المنكر الذي لا يجوز العمل به بحال ، إلى رتبة الضعيف الذي يجوز العمل به في الفضائل ، وربما صارت تلك الطرق الواهية بمنزلة الطريق التي فيها ضعف يسير ، بحيث لو فرض مجيءُ ذلك الحديث بإسناد فيه ضعف يسير ، صار مرتقياً من رتبة الضعيف إلى رتبة الحسن لغيره. "(۲)

---

(۱) فتح المغيث:۱/۷۳

(۲) توجيه النظر:۱/۳۶۹

اسی طرح المناوی نے ''الیواقیت والجواہر''میں اور علامہ جمال الدین الدمشقی رحمۃ اللہ نے ''قواعد التحدیث''میں لکھا ہے۔(۱)

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جو حدیث کذب راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہو جس کو موضوع کہا جاتا ہے، وہ تعدد طرق کی وجہ سے حسن یا صحیح لغیرہ تو نہیں بنتی؛ لیکن اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ بے اصل یا منکر ہونے سے نکل جاتی ہے اور یہ سارے طرق مل کر اس حدیث کو ایک ایسی ضعیف حدیث کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں کہ وہ فضائل میں قابل عمل ہوتی ہے؛ بل کہ بعض وقت کثرت طرق اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ وہ سب مل کر حسن لغیرہ کے درجے تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔

چناں چہ یہی بات ان احادیث کے بارے میں علامہ سیوطی نے ''شرح الصدور'' میں اور ملا علی قاری نے ''مرقاۃ شرح مشکاۃ''میں لکھی ہے، وہ مذکورہ بعض احادیث کو ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ

''وهي و إن كانت ضعيفة ، فمجموعها يدل على أن لذلک أصلاً .''

ترجمہ: یہ احادیث اگر چہ کہ ضعیف ہیں؛ مگر ان کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے۔(۲)

مگر عجیب بات ہے کہ علامہ عبد الرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ نے ملا علی قاری کے حوالے سے سیوطی کا یہ قول نقل کر کے یہ لکھا کہ

'' قلت : قوله : فمجموعها يدل على أن لذلک أصلاً ، فيه تأمل ، فلينظر هل يدل مجموعها على أن لذلک أصلاً

(۱) دیکھو: الیواقیت: ۱/۱۷۱، قواعد التحدیث: ۱/۶۶

(۲) شرح الصدور: ۳۱۱، مرقاۃ المفاتیح: ۵/۴۶۵

أم لا ، وليس كل مجموع من عدة أحاديث ضعاف يدل على أن لها أصلاً .»[1]

اوپر پیش کردہ اصول جس کو حضرات محدثین نے اصول حدیث کی کتابوں میں بیان کیا ہے، اس سے علامہ مبارکپوری کی نظر کا جواب ہوگیا۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عبادات بدنیہ کا ثواب مرحومین کو پہنچنا دلائل کی روشنی میں ثابت ہے اوراس میں سے قرآن کی تلاوت کا ثواب پہنچنا بھی متعدد دلائل سے ثابت ہے:

ایک تو روزے کے بارے میں واردروایات پر قیاس ہے کہ جب روزہ میت کی جانب سے ہوسکتا ہے تو قرآن پڑھنے کا ثواب نہ پہنچنا، متماثلین کے درمیان تفریق ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔

دوسرے قبر کے پاس یا دفن کے وقت قرآن پڑھنے کی ترغیب واستحباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت علا وحضرت ابن عمر سے مروی ہے، جس سے میت کو اس سے فائدہ ہونا، ثواب پہنچنا مفہوم ہوتا ہے۔

تیسرے ٹہنی سے میت کے عذاب میں تخفیف کی روایات سے بھی یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ قرآن پڑھنے وذکر سے میت کو ثواب پہنچتا ہے؛ کیوں کہ جب ایک ٹہنی کے ذکر سے میت کو فائدہ ہوسکتا ہے تو ایک انسان کے قرآن کی تلاوت کرنے سے کیوں فائدہ نہیں پہنچ سکتا؟

چوتھے ان متعدد موضوع احادیث کے مجموعے سے بھی ایک درجے میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کی تلاوت کا ثواب میت کو پہنچنا بے اصل بات نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر ہر بات کی مکمل وضاحت وتفصیل عرض کردی گئی ہے۔

---

(۱) تحفة الأحوذي: ۵/۳۰۴

چوتھی فصل

جان و مال سے مرکب عبادات (یعنی حج وعمرہ) سے ایصالِ ثواب

ایصالِ ثواب کی ایک شکل حج اور عمرہ ہے، اس کے بارے میں بعض حضرات علما نے نقل کیا ہے کہ اس کے جائز و صحیح ہونے پر بھی تمام علما وائمہ کا اتفاق ہے۔ چناں چہ امام ابن القیم رحمہ اللہ کی عبارت ابھی اوپر گزری جس میں انھوں نے لکھا کہ حج کا ثواب مرحومین کو پہنچنے کے بارے میں اتفاق واجماع ہے، ہاں اختلاف یہ ہے کہ بذاتِ خود اس عمل حج کا ثواب پہنچے گا یا حج میں کیے جانے والے خرچ کا؟ تاہم اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے ثواب ملے گا۔

اسی طرح علامہ نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم کی ایک عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حج کا ثواب مردوں کو پہنچنے کے بارے میں اتفاق ہے۔(۱)

مگر جہاں تک احقر کی معلومات ہیں، ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ائمہ کے مابین کچھ اختلاف ہے۔

حج سے ایصالِ ثواب کے بارے مسالک ائمہ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حج اگر فرض ہے تو اس میں دوسرے کی جانب سے نیابت کے بارے میں بعض شرائط کے ساتھ تین ائمہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ

(۱) شرح مسلم: ۱/۳۲۴

کا اتفاق ہے کہ یہ جائز و درست ہے؛ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ: یہ جائز و درست نہیں۔

"الموسوعة الفقهية" میں صراحت سے لکھا ہے کہ

"ذَهَبَ الْجُمْهُورُ (الْحَنَفِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَابِلَةُ) إِلَى مَشْرُوعِيَّةِ الْحَجِّ عَنِ الْغَيْرِ، وَ قَابِلِيَّتِهِ لِلنِّيَابَةِ، وَ ذَهَبَ مَالِكٌ عَلَى الْمُعْتَمَدِ فِي مَذْهَبِهِ إِلَى أَنَّ الْحَجَّ لاَ يَقْبَلُ النِّيَابَةَ لاَ عَنِ الْحَيِّ وَلاَ عَنِ الْمَيِّتِ، مَعْذُورًا أَوْ غَيْرَ مَعْذُورٍ وَقَالُوا: إِنَّ الأَفْضَلَ أَنْ يَتَطَوَّعَ عَنْهُ وَلِيُّهُ بِغَيْرِ الْحَجِّ، كَأَنْ يُهْدِيَ أَوْ يَتَصَدَّقَ عَنْهُ، أَوْ يَدْعُوَ لَهُ، أَوْ يُعْتِقَ."

ترجمہ: جمہور یعنی حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ دوسرے کی جانب سے حج کی مشروعیت اور حج کے قابل نیابت ہونے کی طرف گئے ہیں اور امام مالک معتمد قول کے مطابق اس جانب گئے ہیں کہ حج نیابت کو قبول نہیں کرتا، نہ زندے کی طرف سے نہ مردے کی طرف سے، خواہ وہ معذور ہو یا معذور نہ ہو اور یہ لوگ یعنی مالکیہ کہتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ مردے کی جانب سے اس کا ولی حج کے علاوہ کسی اور نیک کام کو نفل کے طور پر انجام دے، جیسے قربانی یا صدقہ کرے یا دعا کرے یا غلام کو آزاد کرے۔(۱)

اس عبارت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حج فرض دوسرے کی جانب سے کرنے کے بارے میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسرے یہ بھی پتہ چلا کہ اس میں تین ائمہ اور ان کے اصحاب کا قول جواز کا ہے۔ تیسرے یہ معلوم ہوا کہ امام مالک کے نزدیک حج فرض دوسرے کی جانب سے انجام دینا درست نہیں ہے۔

---

(۱) الموسوعة الفقهية: ۱۷/۲/۷۲-۷۳

اس سلسلے میں مذاہب اربعہ کی معتبر کتب سے چند حوالے ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ تا کہ بات واضح ہو جائے۔

حنفیہ کا مسلک

احناف کا مسلک یہ ہے کہ دوسرے کی جانب سے حج فرض انجام دیا جا سکتا ہے؛ بشرطیکہ جس کا حج ادا کرنا ہے وہ دائمی طور پر حج ادا کرنے سے عاجز ہو، خواہ اس لیے کہ انتقال ہو گیا، یا کسی ایسی بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے جس کے ساتھ وہ سفر کے قابل نہ ہو۔(۱)

شافعیہ کا مسلک

یہی مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ کا بھی ہے، شوافع کے یہاں بھی حج میں نیابت ہو سکتی ہے، امام ماوردی شافعی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ

” فَإِذَا اسْتَقَرَّ فَرْضُ الْحَجِّ فِي ذِمَّتِهِ ، وَمَاتَ قَبْلَ أَدَائِهِ لَمْ يَسْقُطْ عَنْهُ بِمَوْتِهِ ، وَوَجَبَ أَنْ يُقْضَى عَنْهُ مِنْ رَأْسِ مَالِهِ وَصَّى بِهِ أَمْ لَا ، وَكَذٰلِكَ الدَّيْنُ ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ ، كَانَ الْوَارِثُ بِالْخِيَارِ إِنْ شَاءَ قَضَاهُ عَنْهُ ، وَإِنْ شَاءَ لَمْ يَقْضِهِ“

ترجمہ: اگر کسی شخص کے ذمہ میں حج فرض رہ جائے اور وہ اس کے ادا کرنے سے پہلے انتقال کر جائے، تو وہ حج اس سے ساقط نہ ہوگا اور اس کے مال میں سے اس کی قضا کرنا واجب ہوگا، خواہ اس نے اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، اسی طرح قرض بھی ہے، پس اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو اس کے وارث کو اختیار ہے خواہ اس کی جانب سے ادا کرے یا نہ کرے۔(۲)

امام رافعی شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ

---

(۱) المبسوط للسرخسي:۴/۱۵۲، البحر الرائق:۳/۱۰۷، المحيط البرهاني:۳/۳۶

(۲) الحاوي الكبير:۴/۱۶

” لا يخفى أن العبادات بعيدة عن قبول النيابة ؛ لكن احتمل في الحج أن يحج الشخص عن غيره إذا كان المحجوج عنه عاجزاً عن الحج بنفسه ؛ إما بسبب الموت ، وإما بكبر ، أو زمانة ، أو مرض لا يُرجى زواله.“

ترجمہ: یہ بات مخفی نہ رہے کہ عبادات نیابت کو قبول کرنے سے بعید ہیں؛ لیکن حج میں یہ گنجائش ہے کہ ایک شخص کسی اور کی جانب سے حج کرے جبکہ جس کی جانب سے حج کیا جارہا ہے وہ خود حج کرنے سے عاجز ہو، یا تو موت ہو جانے کے سبب سے یا بڑھاپے کی وجہ سے یا اپاہج ہو جانے کی وجہ سے یا ایسی بیماری کی بنا پر کہ جس سے شفایاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ شوافع کے یہاں بھی حج میں نیابت ہوسکتی ہے، بشرطیکہ وہ شخص انتقال کر گیا ہو یا اس کو عذر و عجز دائمی ہو جیسا کہ حنفیہ کے نزدیک ہے اور اگر اس کا وارث چاہے تو وہ اس کی جانب سے اس کو ادا کرسکتا ہے۔

حنابلہ کا مسلک

امام احمد اور حنابلہ کے یہاں بھی یہی مسئلہ ہے کہ اگر کسی کے ذمہ حج فرض تھا اور وہ معذوری کی وجہ سے نہ کرسکے اور اس کے پاس کسی کو حج پر بھیجنے کے لیے مال بھی موجود ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ کسی کو اپنی جانب سے حج پر روانہ کرے اور اگر کوئی کسی مرحوم کی جانب سے حج فرض یا نفل اپنی جانب سے ادا کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی نے ”المغني“ میں لکھا ہے کہ

” وَجُمْلَةُ ذَلِکَ أَنَّ مَنْ وُجِدَتْ فِيهِ شَرَائِطُ وُجُوبِ الْحَجِّ ،

---

(۱) الشرح الكبير للرافعي:۳/۳۰۰

وَكَانَ عَاجِزًا عَنْهُ لِمَانِعٍ مَأْيُوسٍ مِنْ زَوَالِهِ ، كَزَمَانَةٍ، أَوْ مَرَضٍ لَا يُرْجَى زَوَالُهُ ، أَوْ كَانَ نِضْوَ الْخَلْقِ ، لَا يَقْدِرُ عَلَى الثُّبُوتِ عَلَى الرَّاحِلَةِ إِلَّا بِمَشَقَّةٍ غَيْرِ مُحْتَمَلَةٍ ، وَالشَّيْخُ الْفَانِي ، وَمَنْ كَانَ مِثْلَهُ مَتَى وَجَدَ مَنْ يَنُوبُ عَنْهُ فِي الْحَجِّ ، وَمَالًا يَسْتَنِيبُهُ بِهِ ، لَزِمَهُ ذٰلِكَ ."

ترجمہ: خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس شخص میں وجوب حج کی شرائط پائی جائیں اور وہ اس کو ادا کرنے سے کسی ایسے عذر کی وجہ سے عاجز ہو، جس کے ختم ہونے سے وہ مایوس ہو، جیسے اپاہج پن یا ایسی بیماری جس کے زائل ہونے کی امید نہ ہو یا اعضاء کا کٹا ہوا ہونا، جس سے سواری پر بیٹھے رہنے پر وہ بغیر ناقابل برداشت مشقت کے قادر نہ ہو اور بہت بوڑھا شخص یا جو اس کے جیسا ہو، یہ لوگ اگر حج ادا کرنے کے سلسلے میں کوئی نائب اور مال پائیں تو اس پر حج کرانا لازم ہو جائے گا۔(۱)

اور یہی بات حنابلہ کی دیگر کتب جیسے" المبدع:۳/۳۶، الشرح الکبیر:۳/۱۷۷، الفروع:۵/۲۶۶" وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

اس تفصیل اور ان حوالجات سے یہ بات بخوبی روشن ہوگئی کہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک دوسرے کی جانب سے حج فرض میں نیابت بعض شرائط کے ساتھ صحیح ہے۔

مالکیہ کا مسلک

اب رہے امام مالک تو ان کے مسلک میں اس سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں؛ مگر حضرات ائمہ مالکیہ نے ان کے مسلک میں جس قول کو معتمد قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ حج میں

(۱) المغني لابن قدامة:۵/۱۹

کسی زندے شخص کی نیابت جائز نہیں، خواہ وہ معذور ہو یا معذور نہ ہو اور یہ حج خواہ فرض ہو یا نفل، ہر دو صورت میں یہ جائز نہیں اور میت کی جانب سے حج کی نیابت اس صورت میں جائز ہے جبکہ میت کی اس سلسلے میں کوئی وصیت موجود ہو، لہٰذا اگر مرحوم نے وصیت کی تھی، تو اس کی جانب سے دوسرا آدمی حج کر سکتا ہے؛ مگر اس صورت میں بھی یہ کراہت کے ساتھ ادا ہوگا۔

چناں چہ علامہ دسوقی مالکی رحمۃ اللہ "الشرح الکبیر للدردیر" کے حاشیہ میں بعد بحث تحریر فرماتے ہیں کہ

" وَالْمُعْتَمَدُ مَنْعُ النِّيَابَةِ عَنِ الْحَيِّ مُطْلَقًا ؛ أَيْ سَوَاءٌ كَانَ صَحِيحًا أَوْ مَرِيضًا ، كَانَتِ النِّيَابَةُ فِي الْفَرْضِ أَوْ فِي النَّفْلِ ، وَلَا فَرْقَ بَيْنَ أَنْ تَكُونَ النِّيَابَةُ بِأُجْرَةٍ ، أَوْ تَطَوُّعٍ"

ترجمہ: معتمد قول یہ ہے کہ زندے کی جانب سے نیابت مطلقاً ممنوع ہے، خواہ وہ تندرست ہو یا مریض ہو اور نیابت فرض میں ہو یا نفل میں اور اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ نیابت اجرت کے ساتھ ہو یا بلا اجرت۔(۱)

اس میں تو یہی مذکور ہے کہ اجرت سے یا بلا اجرت، زندے کی جانب سے نیابت جائز نہیں؛ لیکن بعض مالکی فقہا نے بلا اجرت کسی کی جانب سے حج میں نیابت کو درست؛ بل کہ مستحسن قرار دیا ہے، جیسے صاحب شرح العمدۃ وغیرہ نے؛ مگر علامہ دسوقی اسی جگہ لکھتے ہیں کہ: اس قول کو زندے کی جانب سے نہیں؛ بل کہ میت کی جانب سے نیابت پر محمول کرنا چاہیے، لہٰذا اگر کوئی شخص بلا اجرت مرحوم کی جانب سے حج ادا کر دے تو یہ مستحسن ہوگا۔

اسی طرح ایک اور مالکی فقیہ علامہ محمد العربی القروی رحمۃ اللہ نے "الخلاصة الفقهية" میں مالکیہ کا مسلک یہی لکھا ہے کہ:

---

(۱) حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: ۲/ ۱۸

”إن النيابة في الحج عن الحي لا تجوز ، سواء كان المحجوج عنه مستطيعاً أولا ، و سواء كان الحج فرضاً أو نفلاً ، و لا تصح إلّا عن ميت أوصى بالحج مع الكراهة، كما يكره للنائب.“

ترجمہ: حج میں کسی زندہ کی جانب سے نیابت جائز نہیں، خواہ وہ تندرست ہو یا نہ ہو اور خواہ حج فرض ہو یا نفل اور میت کی جانب سے بھی حج میں نیابت اسی وقت جائز ہو سکتی ہے، جب کہ اس نے حج کی وصیت کی ہو، تو اس صورت میں یہ کراہت کے ساتھ جائز ہوگا جیسا کہ نائب کے حق میں بھی یہ مکروہ ہے۔(۱)

اگر مرحوم کی جانب سے نیابت کرتے ہوئے حج فرض کیا جائے تو اس کا حکم مالکیہ کے نزدیک کیا ہے؟ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ ایک صورت میں جائز مع الکراہت ہے، وہ یہ کہ مرحوم نے اس کی وصیت کی ہو۔ اسی طرح دیگر کتب مالکیہ میں مصرح ہے۔(۲)

یہ ساری بحث اور اس سلسلے کی شرائط کسی کی جانب سے حج فرض کرنے کے بارے میں ہیں؛ لیکن اگر کوئی شخص اپنی جانب سے کسی کے لیے نفلی حج کرنا چاہے تو جمہور کے نزدیک بلا کسی شرط کے اس کی اجازت ہے۔ البتہ شوافع کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔

” اتَّفَقَ الْجُمْهُورُ عَلَى مَشْرُوعِيَّةِ حَجِّ النَّفْل عَنِ الْغَيْرِ بِإِطْلاَقٍ ، وَهُوَ مَذْهَبُ الْحَنَفِيَّةِ وَأَحْمَدَ وَأَجَازَهُ الْمَالِكِيَّةُ أَيْضًا مَعَ الْكَرَاهَةِ فِيهِ وَفِي النِّيَابَةِ فِي الْحَجِّ الْمَنْذُور ، أَمَّا الشَّافِعِيَّةُ فَفَصَّلُوا وَقَالُوا : لاَ تَجُوزُ الاِسْتِنَابَةُ فِي حَجِّ النَّفْل عَنْ حَيٍّ

(۱) الخلاصة الفقهية:۱/۲۰۸

(۲) دیکھو: شرح خليل للخرشي منح الجليل:۱/۱۵۰

لَيْسَ بِمَعْضُوبٍ ، وَلاَ عَنْ مَيِّتٍ لَمْ يُوصِ بِهِ ، أَمَّا الْمَيِّتُ الَّذِي أَوْصَى بِهِ وَالْحَيُّ الْمَعْضُوبُ إِذَا اسْتَأْجَرَ مَنْ يَحُجُّ عَنْهُ فَفِيهِ قَوْلاَنِ مَشْهُورَانِ لِلشَّافِعِيَّةِ ؛ أَصَحُّهُمَا الْجَوَازُ ، وَأَنَّهُ يَسْتَحِقُّ الأُجْرَةَ "

ترجمہ: جمہور علما کا دوسرے کی جانب سے مطلقاً حج نفل ادا کرنے کی مشروعیت پر اتفاق ہے اور یہی حنفیہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے اور مالکیہ نے بھی کراہت کے ساتھ حج نفل میں اور حج نذر میں نیابت کے بارے میں اس کی اجازت دی ہے اور اب رہے شوافع حضرات تو انھوں نے اس میں تفصیل بیان کی ہے، انھوں نے کہا کہ حج نفل میں غیر معذور زندہ آدمی کی جانب سے نیابت جائز نہیں اور نہ کسی میت کی جانب سے جس نے وصیت نہ کی ہو، رہی وہ میت جس نے حج کی وصیت کی ہے اور وہ زندہ آدمی جو معذور و عاجز ہے اگر وہ کسی کو حج کے لیے اجرت پر لے تو اس میں شافعیہ کے دو قول مشہور ہیں ان میں سے اصح قول جواز کا ہے اور یہ کہ اجرت پر حج کرنے والا اجرت کا مستحق بھی ہوگا۔ (1)

مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن نُجیم مصری رحمۃ اللہ نے "البحر الرائق" میں لکھا ہے کہ

"وَ إِنَّمَا شُرِطَ عَجْزُ الْمَنُوبِ لِلْحَجِّ الْفَرْضِ لَا النَّفْلِ لِجَوَازِ الْإِنَابَةِ مَعَ الْقُدْرَةِ فِي حَجِّ النَّفْلِ ؛ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنْهُ الثَّوَابُ فَإِذَا كَانَ لَهُ تَرْكُهُ أَصْلًا فَلَهُ تَحَمُّلُ مَشَقَّةِ الْمَالِ بِالْأَوْلَى"

"یہ شرط کہ جس کی جانب سے حج کیا جائے وہ عاجز ہو، یہ قید حج فرض کے لیے ہے نہ کہ حج نفل کے لیے؛ کیوں کہ حج نفل میں طاقت ہونے کے

---

(1) الموسوعة الفقهية:۱۷/ ۷۷-۷۶

باوجود دوسرے کی نیابت جائز ہے، اس لیے کہ اس صورت میں ثواب مقصود ہوتا ہے؛ لہذا جب دوسرے کی جانب سے نفل حج بالکل ہی نہ کرنے کی گنجائش ہے تو اس کی جانب سے صرف مالی مشقت برداشت کر لینا بدرجۂ اولی جائز ہے۔"(۱)

علامہ سرخسی "مبسوط" میں فرماتے ہیں کہ

" وَالْحَجُّ التَّطَوُّعُ جَائِزٌ عَنْ الصَّحِيحِ يُرِيدُ أَنَّ بِهِ الصَّحِيحَ الْبَدَنِ إذَا أَحَجَّ رَجُلًا بِمَالِهِ عَلَى سَبِيلِ التَّطَوُّعِ عَنْهُ فَهُوَ جَائِزٌ ؛ لِأَنَّ هَذَا إنْفَاقُ الْمَالِ فِي طَرِيقِ الْحَجِّ ، وَلَوْ فَعَلَهُ بِنَفْسِهِ كَانَ طَاعَةً عَظِيمَةً فَكَذَلِكَ إذَا صَرَفَهُ إلَى غَيْرِهِ لِيَفْعَلَهُ عَنْهُ يَكُونُ جَائِزًا وَكَوْنُهُ صَحِيحًا لَا يَمْنَعُهُ عَنْ أَدَاءِ التَّطَوُّعِ بِهَذَا الطَّرِيقِ ، وَإِنْ كَانَ يَمْنَعُهُ عَنْ أَدَاءِ الْفَرْضِ ؛ لِأَنَّ فِي التَّطَوُّعِ الْأَمْرُ مُوَسَّعٌ عَلَيْهِ."

ترجمہ: نفلی حج تندرست آدمی کی جانب سے جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تندرست آدمی اگر اپنے مال سے کسی کو نفلی حج اپنی جانب سے کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس شخص کی جانب سے حج درست ہو جائیگا؛ کیوں کہ یہ حج کے لیے مال خرچ کرنا ہے۔ اگر وہ شخص بذاتِ خود حج کرتا تو جیسے یہ بہت بڑی اطاعت ہوتی، اسی طرح جب وہ پیسہ کسی اور کو دیدے؛ تا کہ وہ اس کی جانب سے کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ رہا اس شخص کا تندرست ہونا، یہ اس طور پر نفلی حج کے صحیح ہونے کے لیے مانع نہیں ہے۔ اگر چہ کہ یہ بات (تندرست ہونا) حج فرض کی دوسروں کی جانب سے ادائیگی کے لیے مانع ہے؛ کیوں کہ نفل میں گنجائش ہوتی ہے۔(۲)

---

(۱) البحر الرائق :۳/۱۱۰

(۲) المبسوط للسرخسي:۴/۱۵۲

اسی طرح امام رافعی کبیر شافعی نے لکھا ہے کہ

" و (أما حجة التطوع)فهل يجوز استنابة المعضوب فيها واستنابة الوارث للميت ؟ فيه قولان:(أحدهما: لا)؛ لبعد العبادات البدنية عن قَبول النيابة ، وإنما جوزنا في الفرض للضرورة . (و أصحهما) : و به قال مالك ، وأبو حنيفة ، وأحمد رحمهم الله (نعم) ؛ لأنها عبادة تدخل النيابة في فرضها فتدخل في نفلها كأداء الزكاة. (۱)

ترجمہ: جہاں تک نفل حج کی بات ہے تو کیا اس میں کمزور کا اور وارث کا مرنے والے کی جانب سے کسی کو نائب بنانا جائز ہے؟ اس سلسلہ میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ جائز نہیں؛ کیوں کہ بدنی عبادات نیابت کو نہیں قبول کرتے ، اور فرض میں اس کی اجازت ضرورت کی بنا پر دی گئی ہے۔ دوسرا قول- جو کہ ان دو قولوں میں سے صحیح ترین ہے- یہ کہ جائز ہے، اور یہی مسلک امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ کا ہے؛ اس لیے کہ جب فرض عبادات بدنیہ میں نیابت چل سکتی ہے تو نفلی عبادات بدنیہ میں بدرجۂ اولی چلے گی، جیسے زکات کی ادائیگی۔

مالکیہ کے یہاں بھی ایک روایت میں اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چناں چہ امام ابن عبد البر اپنی کتاب "الكافي في فقه أهل المدينة "میں لکھتے ہیں کہ

" و من تطوع بالحج أو العمرة عن غيره بعد أن حجّ عن نفسه فحسن إذا كان عن الـميت. "

ترجمہ: جو شخص نفلی حج یا عمرہ کسی کی جانب سے کرے اپنا حج کرنے

(۱) الشرح الكبير للرافعي:۳/۳۰۱

کے بعد تو یہ مستحسن ہے بشرطیکہ میت کی جانب سے ہو یعنی زندے کی جانب سے نہ ہو۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرچہ کہ حج فرض کے بارے میں امام مالک کا اختلاف ہے کہ اس میں دوسرا شخص نیابت کر سکتا ہے یا نہیں؛ لیکن حج نفل کے بارے میں ان کا بھی معتمد قول جواز ہی کا ہے اور اسی طرح امام شافعی کا بھی جواز کا قول ہی اصح مانا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جن حضرات نے حج میں نیابت والے مسئلے کو اجماعی کہا ہے، ان کی مراد یہی نفلی حج میں نیابت کا جواز ہو۔ واللہ اعلم۔

حج سے ایصالِ ثواب کے دلائل

حج کے دوسرے شخص کی جانب سے ادا کیے جانے کے جواز پر علما نے متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے۔

❁ دلیلِ اول

حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

''ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور اس نے سوال کیا کہ میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی، مگر حج کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا، تو کیا میں والدہ کی جانب سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا اس کو نہ ادا کرتی؟ اس نے کہا: کہ ہاں ادا کرتی، آپ نے فرمایا کہ پھر یہ بھی ادا کرو؛ کیوں کہ اللہ وفا کا زیادہ حقدار ہے۔ (۲)

❁ دلیل دوم

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں آیا ہے کہ

---

(۱) الكافي في فقه اهل المدينة :١٦٦؛

(۲) بخاري:۷۳۱۵، سنن بيهقي:۸۹۳۳

''ایک عورت نے حج کی نذر کی تھی، اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا اس کو ادا نہ کرتے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں، آپ نے فرمایا کہ پھر یہ بھی ادا کرو؛ کیوں کہ اللہ وفا کا زیادہ حقدار ہے۔(۱)

دلیل سوم

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ

''حضرت سنان بن سلمہ جہنی کی بیوی نے ان کو یہ مسئلہ معلوم کرنے کے لیے کہا کہ ان کی ماں نے حج نہیں کیا، کیا وہ ان کی طرف سے حج کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں، اگر اس کی ماں پر قرض ہوتا اور یہ اس کا قرض ادا کر دیتی تو کیا کافی نہ ہوتا؟ لہذا وہ ماں کی جانب سے حج کر لے۔(۲)

دلیل چہارم

نیز حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ

''ایک عورت قبیلہ خثعم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد پر حج ایسے زمانے میں لاگو ہوا ہے کہ وہ بہت بوڑھے ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے سواری پر بیٹھ بھی نہیں سکتے، کیا میں ان کا حج کر سکتی

(۱) بخاري:۱۸۵۲،نسائي:۲۶۳۲، أحمد:۲۱۴۰، صحيح ابن خزيمة :۳۰۴۱،سنن بيهقي:۱۳۰۰۳

(۲) نسائي:۲۶۳۳،سنن كبرى نسائي:۳۵۹۹

ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اور یہ واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا تھا(۱)

ان تمام روایات سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ حج کے ذریعے بھی اموات کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے اور اس کا ثواب ان کو پہنچتا ہے۔

الغرض ایصالِ ثواب کی یہ مختلف صورتیں ہیں جن سے ایک شخص اپنے متعلقین و رشتہ داروں کو ثواب پہنچا کر ان کے لیے نجات کی راہ ہموار کرسکتا ہے یا ان کے درجات کی بلندی کا انتظام کرسکتا ہے۔

(۱) بخاري:۱۵۱۳،موطأمالک:۸۹۷،مسلم:۳۳۱۵، أبو داود:۱۸۱۱،نسائي:۲۶۳۵، ابن ماجه:۲۹۰۹، مسند أحمد:۱۸۹۰
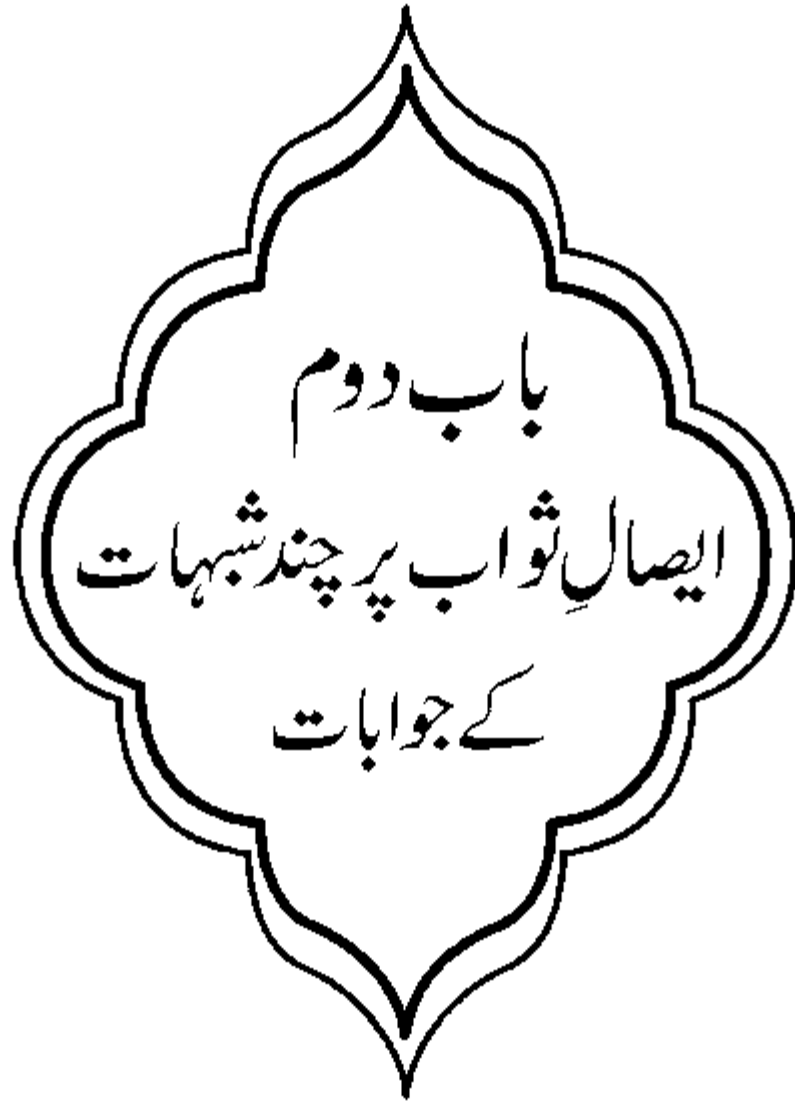
بابِ دوم

ایصالِ ثواب پر چند شبہات کے جوابات

باب دوم

ایصالِ ثواب پر چند شبہات کے جوابات

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے مسئلے پر کیے جانے والے شبہات کا جواب دیں، لہذا آیئے، اس سلسلے میں کیے جانے والے شبہات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ان میں کس قدر قوت ہے۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''الروح'' میں اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، جس کو شوق ہو وہ اس کا مطالعہ کرے۔ ہم یہاں اس سلسلے کے چند بڑے بڑے اعتراضات کا جواب دینا چاہتے ہیں۔

پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ اس سلسلے میں دو قسم کے شبہات پیش کئے جاتے ہیں ایک نقلی شبہات یعنی وہ شبہات جو آیات و احادیث کے حوالے سے پیش کیے جاتے ہیں، دوسرے عقلی شبہات، جو عقل کی بنیاد پر کھڑے کیے جاتے ہیں۔ لہذا ہم دونوں قسم کے اشکالات و شبہات کا جواب یہاں دینے کی کوشش کریں گے۔

ایصالِ ثواب پر آیات و احادیث سے شبہات

پہلے ہم نقلی شبہات کو لیتے ہیں، یعنی ان شبہات کو جو آیات و احادیث کے حوالے سے پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلا شبہ اور جواب

ایک شبہ یا اعتراض قرآن کریم کی ایک آیت کے حوالے سے کیا جاتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ، وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا

سَعٰی .﴾ (سُوْرَةُ النَّجْمِ : ۳۸)

ترجمہ : یہ کہ کوئی انسان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ کسی انسان کو سوائے اس کی محنت کے کچھ اور نہیں ملے گا۔

اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ جب ایک انسان کو اس کی محنت و عمل کے سوا کچھ اور نہیں ملے گا تو اگر کوئی شخص کسی کو ثواب پہنچائے تو اس کو ثواب بھی نہیں پہنچے گا؛ کیوں کہ یہ اس کا اپنا عمل نہیں ہے۔

مذکورہ شبہ کے جواب کی تمہید

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آیات و احادیث میں تعارض نہیں ہوسکتا، جب متعدد احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ میت کو دوسرے کے عمل سے نفع و ثواب ملتا ہے تو اس آیت کو اس کے معارضہ میں پیش کرنا جسارت کی بات ہے۔ لہذا ہم یہاں اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ایک عبارت نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں، پھر اصل جواب کی جانب رجوع کریں گے۔ شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ

"كَذٰلِكَ ظَنَّ قَوْمٌ أَنَّ انْتِفَاعَ الْمَيِّتِ بِالْعِبَادَاتِ الْبَدَنِيَّةِ مِنْ الْحَيِّ يُنَافِي قَوْلَهُ تعالى " ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى .﴾

فَلَيْسَ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ ؛ فَإِنَّ انْتِفَاعَ الْمَيِّتِ بِالْعِبَادَاتِ الْبَدَنِيَّةِ مِنْ الْحَيِّ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْآيَةِ كَانْتِفَاعِهِ بِالْعِبَادَاتِ الْمَالِيَّةِ وَمَنْ ادَّعَى أَنَّ الْآيَةَ تُخَالِفُ أَحَدَهُمَا دُونَ الْآخَرِ فَقَوْلُهُ ظَاهِرُ الْفَسَادِ."

ترجمہ : اسی طرح کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ میت کا زندے کی بدنی عبادات سے منتفع ہونا اللہ کے ارشاد۔ ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی.﴾

کے خلاف ہے؛ مگر بات ایسی نہیں ہے؛ کیوں کہ میت کا زندے کی عبادات بدنیہ سے منتفع ہونا اس آیت کی بہ نسبت ایسا ہی ہے جیسے اس کا مالی عبادات سے نفع اٹھانا اور جو اس بات کا دعوی کرے کہ آیت ان دو میں سے ایک کے منافی ہے دوسرے کی منافی نہیں تو اس کا قول ظاہر الفساد ہے۔(۱)

مذکورہ شبہ کے مختلف جوابات

اب آیئے اس اعتراض کے جواب کی جانب، اس اعتراض کے اگرچہ متعدد جوابات دیے گئے ہیں: مثلاً یہ کہ یہ آیت ایک اور آیت سے منسوخ ہے۔ایک جواب دیا گیا ہے کہ اس آیت میں گزشتہ شریعتوں کا حکم بیان کیا گیا ہے؛ لیکن ہماری شریعت میں ایک کا عمل دوسرے کو نفع دیتا ہے۔ایک جواب یہ دیا گیا کہ یہاں آیت میں انسان سے مراد کافر انسان ہے، نہ کہ مؤمن۔ایک جواب یہ ہے کہ آیت میں "للانسان" میں جو لام آیا ہے اس کے معنے عربی زبان میں ملکیت وایجاب کے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کیا، دوسرے کا کیا ہوا اس کو نہیں ملے گا یعنی بطور ملکیت و ایجاب کے نہیں ملے گا؛ بل کہ اللہ تعالی اپنے فضل سے چاہیں گے تو اس کو مل جائے گا۔(۲)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جوابات کمزور اور نا قابل اعتبار ہیں؛ جیسا کہ علامہ ابن القیم نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ہاں اس کے دو جوابات ایسے ہیں جو قابل لحاظ ہیں:

شبہ کا اصل جواب از علامہ ابن القیم

ایک یہ ہے کہ اس آیت میں دراصل ایک اصول بیان کیا گیا ہے کہ "آدمی کو وہی ملتا

---

(۱) مجموع الفتاوی ابن تیمیة :۱۸/۱۴۳

(۲) تفسیر القرطبي:۱۷/۱۱۴، البحر المحیط:۱۰/۲۴،التحریر والتنویر:۲۷/۱۳۳

ہے جو اس کی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے‘‘ اور اس کی کوشش و محنت میں یہ بھی داخل ہے کہ اس نے اپنے ایمان اور طاعات کی بنیاد پر مؤمنین میں اپنا ایک حلقہ پیدا کیا، جو اس کے دوست واحباب بھی ہیں، اولاد و رشتہ دار بھی ہیں، یہ سب گویا اسی کی سعی وعمل میں داخل ہیں؛ لہٰذا جب یہ مؤمن لوگ اس کے حق میں ثواب پہنچائیں گے تو وہ اس کی سعی ہی کے نتیجے میں پہنچنے والا ثواب ہے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس جواب کو علامہ ابوالوفاء بن عقیل کی جانب سے نقل کر کے اس کو جوابِ متوسط قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اس کی تکمیل کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے ایمان وطاعت سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل کے ساتھ اپنے مؤمن بھائیوں کے عمل سے بھی انتفاع کر سکے، جیسے وہ اپنی زندگی میں ان کے اعمال سے بھی نفع اندوز ہوتا ہے؛ کیوں کہ مؤمن دوسرے مؤمن بھائیوں کے اعمال سے نفع اٹھاتا ہے۔ نماز با جماعت کہ اس کی وجہ سے ہر ایک کا ثواب ستائیس گنا بڑھ جاتا ہے، پس یہاں دوسرے کے عمل سے اس کا ثواب بڑھ گیا؛ لہٰذا کسی بندے کا اسلام میں داخل ہو جانا دوسرے مسلمانوں کی نیکیوں سے نفع اٹھانے کا بہت بڑا سبب ہے، پس جب کوئی ایمان لایا تو اس نے دوسرے مؤمنوں کی نیکی میں حصہ پانے کی سعی وکوشش کی ہے؛ لہٰذا یہ آیت ایصالِ ثواب کے خلاف نہیں ہے۔ (۱)

دوسرا جواب از علامہ ابن تیمیہ

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا ہے کہ انسان کو دوسرے کے عمل کا نفع نہیں پہنچے گا، بل کہ یہ کہا ہے کہ دوسرے کے عمل کا وہ مالک نہیں ہوگا، یہ بالکل برحق ہے؛ لیکن اس سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ دوسرے نے اپنا ثواب کسی کو دیا تو وہ اس کو نہیں پہنچے گا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب پہنچائے

(۱) کتاب الروح بتحقیق بسام علي سلامة العموش:۲۶۵-۲۶۳

جیسا کہ احادیث سے مختلف قسم کے اعمال کا ثواب پہنچنا معلوم ہوتا ہے۔ یہ جواب علامہ ابن القیم رحمہ اللہ اور ان کے شیخ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے:

”أَنَّ الْآيَةَ لَيْسَتْ فِي ظَاهِرِهَا إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ لَهُ إِلَّا سَعْيُهُ ، وَهَذَا حَقٌّ فَإِنَّهُ لَا يَمْلِكُ وَلَا يَسْتَحِقُّ إِلَّا سَعْيَ نَفْسِهِ ، وَأَمَّا سَعْيُ غَيْرِهِ فَلَا يَمْلِكُهُ وَلَا يَسْتَحِقُّهُ ؛ لَكِنْ هَذَا لَا يَمْنَعُ أَنْ يَنْفَعَهُ اللَّهُ وَيَرْحَمَهُ بِهِ ؛ كَمَا أَنَّهُ دَائِمًا يَرْحَمُ عِبَادَهُ بِأَسْبَابٍ خَارِجَةٍ عَنْ مَقْدُورِهِمْ وَهُوَ سُبْحَانَهُ بِحِكْمَتِهِ وَرَحْمَتِهِ يَرْحَمُ الْعِبَادَ بِأَسْبَابٍ يَفْعَلُهَا الْعِبَادُ لِيُثِيبَ أُولَائِكَ عَلَى تِلْكَ الْأَسْبَابِ ، فَيَرْحَمُ الْجَمِيعَ ؛ كَمَا فِي الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ عَنْهُ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّهُ قَالَ ”مَا مِنْ رَجُلٍ يَدْعُو لِأَخِيهِ بِدَعْوَةٍ إِلَّا وَكَّلَ اللَّهُ بِهِ مَلَكًا كُلَّمَا دَعَا لِأَخِيهِ قَالَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهِ :آمِينَ وَلَكَ.“

ترجمہ: مذکورہ آیت اپنے ظاہر کے لحاظ سے صرف یہ بتا رہی ہے کہ انسان صرف اپنے عمل کا مالک ہے اور یہ بات برحق ہے؛ کیوں کہ وہ نہ مالک ہوتا ہے نہ مستحق مگر صرف اپنے عمل کا، رہا دوسرے کا عمل ومحنت تو وہ نہ اس کا مالک ہے نہ اس کا مستحق؛ لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ اللہ تعالی دوسرے کے عمل سے اس کو نفع پہنچائے اور اس پر اس کے ذریعے رحم کرے، جس طرح اللہ تعالی ہمیشہ اپنے بندوں پر مختلف ایسے اسباب سے رحم فرماتے ہیں جو ان کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں اور اللہ تعالی اپنے بندوں پر دوسرے بندوں کے اعمال سے بھی محض اپنی رحمت وحکمت سے رحم فرماتے ہیں تاکہ ان کو بھی ان اسباب کی بنا پر ثواب پہنچے اور ساروں پر رحم کیا جا سکے،

جیسے کہ حدیث صحیح میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی کے حق میں دعاء کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو مقرر کرتے ہیں، وہ شخص جب بھی اپنے بھائی کے حق میں دعا کرتا ہے،تو وہ فرشتہ کہتا ہے کہ آمین اور تیرے حق میں بھی یہ دعا قبول ہو۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت ایصالِ ثواب کے منافی و خلاف نہیں ہے؛ بل کہ اس کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرا شبہ و اشکال

بعض لوگوں نے اس سلسلے میں دو آیات اور پیش کی ہیں

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْخَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.﴾ (سورۃ البقرۃ)

ترجمہ: یہ ایک قوم ہے جو گزر چکی، اسے وہ ملے گا جو اس نے کیا اور تمھیں وہ ملے گا، جو تم نے کیا اور تم سے ان کی اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

دوسری آیت یہ ہے: ﴿فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.﴾ (سورۃ یٰسٓ)

ترجمہ: پس آج کسی شخص پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور تمہیں بدلہ بھی انھیں کاموں کا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

ان آیات میں چوں کہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو گزر گئے ان کو وہ ملے گا جو ان کا عمل ہے اور یہ کہ تمہیں بدلہ اسی چیز کا ملے گا جو تم کیا کرتے تھے، اس لیے دوسرے کے عمل سے کسی کو نفع نہیں ہوسکتا۔

الجواب:

اس کا جواب علامہ ابن القیم نے یہ دیا ہے کہ ان آیات میں برائی کے بدلے کا ذکر

(۱) مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ: ۷/۴۹۹

ہے کہ ہر انسان کو اسی کے برے عمل کا بدلہ ملے گا،کسی کی برائی و گناہ کا وبال کسی اور کو نہیں ملے گا۔ان آیات کا سیاق بھی یہی بتا رہا ہے،اس میں دوسروں کو نیکیوں کے ثواب پہنچنے کی نفی نہیں ہے۔(۱)

تیسرا شبہ

ایک اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے عمل میں سے تین کے سوا سب اعمال منقطع ہو جاتے ہیں،جیسا کہ یہ حدیث اوپر گزر گئی ،لہٰذا ان تین کے سوا دوسرے کسی عمل کا ثواب پہنچنا حدیث کے خلاف ہے اور یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تین عمل اس لیے منقطع نہیں ہوتے کہ وہ مرنے والا ان تین اعمال کا سبب اپنی زندگی میں بن گیا تھا۔لہٰذا ان اعمال کے سوا کسی اور کام کا ثواب نہیں پہنچتا؟

الجواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے،اس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اپنی زندگی میں جو اعمال کرتا ہے اس کے مرنے پر اس کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور اس کا ثواب بھی اس کے حق میں بند ہو جاتا ہے ؛مگر تین وہ اعمال جن کا وہ اپنی زندگی میں سبب بنا ہوا تھا،اس کا ثواب جاری رہتا ہے۔مگر اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دوسرے کے عمل سے بھی اس کو کوئی نفع نہیں پہنچتا ؛کیوں کہ اس میں اس کی نفی نہیں ہے ؛ حدیث مذکور میں ہر بندے کے اس کے اعمال کے بارے میں اصول بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس کی زندگی تک محدود ہے،سوائے ان اعمال کے جن کا وہ ذریعہ بنا ہو؛لیکن دوسرا آدمی عمل کر کے اس کا ثواب پہنچائے ،تو وہ بھی اس کو نہیں پہنچتا،اس کا کوئی ذکر اس حدیث میں نہیں ہے۔(۲)

---

(۱) كتاب الروح بتحقيق بسام علي سلامه العموش: ۴۶۶

(۲) دیکھو: الروح لابن القیم:۴۶۸، مجموع الفتاوی لابن تیمیة:۳۱۲/۲۴

ایصالِ ثواب پر کیے جانے والے عقلی شبہات کا جواب

رہے عقلی شبہات تو وہ بھی کئی ہیں، لیکن یہاں تمام کے بارے میں گفتگو کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی؛ لہذا ان میں سے چند اہم اعتراضات کا جواب یہاں دیا جاتا ہے۔

پہلا عقلی شبہ

ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب ایک انسان اپنی ایک حالت پر انتقال ہو گیا خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، تو اس کے بعد کسی اور کے عمل سے اس کی اس حالت میں کیا تبدیلی ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی برائی کرتے ہوئے فاسق و فاجر بن کر دنیا سے چلا گیا، تو کیا ایصالِ ثواب سے دوسرے لوگ اس کو جنتی و مقرب بارگاہ بنا سکتے ہیں؟

مذکورہ شبہ کا الزامی جواب

یہ شبہ بظاہر بڑا قوی معلوم ہوتا ہے؛ مگر حقیقت کے لحاظ سے اس میں کوئی جان نہیں، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض وسوال کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو حدیث نبوی کو حجت مانتا ہو گا یا حدیث کو حجت نہیں مانتا ہو گا۔

اگر وہ حدیث کو حجت مانتا ہے تو ہم اس سے کہیں گے کہ تمہارا یہ سوال تو براہ راست ان احادیث پر واقع ہوتا ہے جن میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کے حق میں دعا و استغفار کرنے کی ترغیب دی ہے، نیز میت کی جانب سے حج کرنے، یا روزہ رکھنے، صدقہ دینے وغیرہ کی ترغیب دی ہے، جیسا کہ مفصلاً اوپر گزر گیا، اسی طرح یہ اعتراض ان احادیث پر بھی واقع ہو گا جن میں بندوں کے حق میں حضرات انبیا و اولیا بالخصوص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذکر ہے، اسی طرح جن میں حفاظ و علما کی شفاعت کا ذکر ہے، کہ ان سب کی سفارش و شفاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جہنمی کو جنت میں بھیج دیں گے، تو اب سوال یہ ہے کہ پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ احکام یا ترغیبات کیوں دیے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے ان نبیوں اور ولیوں اور حفاظ کی

شفاعت کو کیوں مشروع کیا ہے؟ کیا یہاں بھی وہی سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ایک آدمی جب ایک حالت پر مر چکا ہے تو اب اس کے حق میں دعا واستغفار اور صدقہ وخیرات یا سفارش کیوں؟ اب دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہئے کہ ان چیزوں سے میت کو کوئی نفع نہیں، یا یوں فرمائیے کہ اس سے میت کو نفع ہے۔ اگر پہلی صورت مانتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ جب اس کا کوئی نفع میت کو نہیں ہوتا تو پھر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کی ترغیب کیوں دی؟ اور اگر یوں کہتے ہیں کہ نفع ہے تو ہمارا مدعیٰ ثابت ہو گیا اور ظاہر ہے کہ یہی شق ثانی حق وصواب ہے۔

جب احادیث صحیحہ کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ میت کو دعا واستغفار سے اور صدقہ وغیرہ سے نفع ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ شبہ کسی مسلمان کی جانب سے نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مسلمان تو احادیث پر یقین کرتا ہے۔

ہاں! اگر یہ سوال واعتراض کرنے والا احادیث ہی کو حجت نہیں مانتا تو بات دوسری ہے، ہم پہلے اس سے اسی موضوع پر گفتگو کریں گے کہ احادیث حجت ہیں یا نہیں؟

ان لوگوں کا اصل جواب تو اسی قدر ہے؛ تاہم بطور تبرع ہم بعونہ تعالیٰ اس کا تفصیلی وتحقیقی جواب بھی یہاں دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

شبہ مذکورہ کا تحقیقی جواب

اس شبہ کا جواب سمجھنے سے پہلے دو باتیں جان لینا چاہیے

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ایک شان، شانِ عدل ہے تو دوسری شان، شانِ فضل ہے اور یہ بھی اہل حق کے نزدیک مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے عدل پر غالب ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ عدل کی جگہ اپنے فضل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔

چناں چہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ

« إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ: إِنَّ رَحْمَتِي

سَبَقَتْ غَضَبِي فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ.»

ترجمہ: اللہ تعالی نے مخلوقات کے پیدا کرنے سے پہلے ایک بات یہ لکھ دی تھی کہ ’’بلا شبہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے‘‘ اور یہ بات اللہ کے پاس عرش کے اوپر لکھی ہوئی ہے۔(۱)

دوسری بات یہ کہ یہ فضل خداوندی کا معاملہ جس طرح انسان کی اس دنیوی زندگی میں جاری رہتا ہے، اسی طرح اس کی بعد الموت زندگی میں بھی جاری رہتا ہے؛ کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالی صرف دنیوی زندگی تک ہی بندوں کے ساتھ فضل کا معاملہ نہیں کرتے: بلکہ جس طرح یہاں فضل وکرم اور احسان وانعام فرماتے ہیں اسی طرح وہاں بھی کرتے ہیں۔

جب یہ دو باتیں معلوم ہوگئیں تو اب یہ سمجھ لیں کہ ایصال ثواب درحقیقت اللہ تعالی کے اسی فضل وکرم اور اس کے احسان وانعام کی ایک شکل ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالی اپنی بے انتہاء مہربانیوں اور کرم نوازیوں کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ بندوں کی بخشش ومغفرت کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے، اگر بندہ یہاں دنیا میں رہتے ہوئے یہ پیدا کر لے تو بہت بہتر اور اگر یہاں نہیں پیدا کر سکا تو اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہاں کوئی صورت پیدا ہو جائے۔اور اسی کے لیے اللہ تعالی نے حضرات انبیاء کرام واولیائے عظام، حفاظ وعلما وغیرہ کی شفاعت کا سلسلہ جاری کیا ہے اور اسی کے لیے ایک شکل وصورت ایصال ثواب کی بھی جاری فرمائی گئی ہے؛ تاکہ بندوں کی مغفرت وبلندئ درجات کا سلسلہ جاری رہے۔اب غور کیجیے کہ کیا اس میں کوئی بات عقل کے خلاف ہے؟ جس کی وجہ سے ایصال ثواب کے بارے میں کہا جائے کہ ایصال ثواب عقل کے خلاف ہے؟ یا یہ کہ یہ عین عقل کے موافق ہے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا رحیم وکریم ہونا خود عقل کا تقاضا ہے اور یہ بھی کہ اس کی رحمت ومہربانی صرف دنیوی زندگی تک محدود نہ ہو؛ بل کہ آخرت میں بھی اس کا یہ رحم وکرم جاری رہے۔

---

(۱) بخاري:۷۵۵۴،واللفظ له ، مسلم:۷۱۴۵،أحمد:۸۹۴۵

دوسرا عقلی شبہ

دوسرا عقلی شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عبادات کا مقصود تو انسان کا امتحان و ابتلاء ہے، لہذا جو انسان عبادت کرے گا وہی اس ابتلا و امتحان سے گزرے گا اور اس کا نفع اسی کو حاصل ہوگا؛ لیکن اگر ایک شخص نے کوئی نیکی و عبادت کر کے اس کا ثواب دوسرے کو پہنچا دیا تو یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں عبادت کرنے والا تو عبادت کر رہا ہے؛ مگر جس کو ثواب پہنچایا گیا وہ اس امتحان سے نہیں گزرا؛ لہذا ایصال ثواب کو جائز ماننا دراصل اس امتحان و ابتلاء کے خلاف ہے؟

مذکورہ اعتراض کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک خود عبادت اور دوسرے اس کا ثواب، جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ عبادات میں مقصود امتحان و آزمائش ہے، یہ بذات خود عبادات کے بارے میں ہے، نہ کہ ثواب عبادات کے بارے میں؛ لہذا یہ امتحان اس زندہ شخص کے حق میں ثابت و متحقق ہے جو عبادت انجام دینے والا ہے اور رہا ثوابِ عبادت تو اس کے حق میں امتحان و آزمائش والی بات صحیح نہیں ہے؛ لہذا ایک شخص عبادت انجام دے اور اس کا ثواب دوسرے کو پہنچائے تو ثواب پانے میں امتحان کے دور سے گزرنا کیا ضروری ہے؟ ہاں اگر میت کی جانب سے نیابت کرتے ہوئے کوئی عبادت انجام دی جائے تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے بارے میں ائمہ کے مسالک ہم نے اوپر بیان کر دئے ہیں؛ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، ایصالِ ثواب الگ چیز ہے اور نیابت دیگر چیز۔

تیسرا عقلی شبہ

اس سلسلے میں ایک شبہ یہ ہے کہ انسان کو عبادات و نیکیوں کا جو ثواب ملتا ہے، اس کا وہ مالک نہیں ہوتا؛ لہذا اس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس میں تصرف کرے اور کسی کو ہدیہ دے؛ اس لیے وہ اپنے اعمال کا ثواب کسی کو نہیں دے سکتا؟

مذکورہ شبہ کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ اس شبہ میں جو کہا گیا ہے کہ انسان اپنے عمل کے ثواب کا مالک نہیں ہوتا، یہ خود ایک دعوی ہے جو محتاج دلیل ہے؛ بل کہ آیت کریمہ سے تو اس کے خلاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل کا مالک ہوتا ہے، چناں چہ ہم نے اوپر علامہ ابن تیمیہ کی ایک عبارت مذکورہ آیت سے شبہ پیش کرنے والوں کے جواب کے تحت نقل کی ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل کا مالک و مستحق ہوتا ہے، دوسرے کے اعمال کا مالک نہیں ہوتا۔ جب بات یہ ہے کہ از روئے قرآن انسان اپنے اعمال کے ثواب کا مالک ہوتا ہے، تو اس میں تصرف کا بھی مالک ہوتا ہے، لہذا ایصالِ ثواب درست ہونا چاہئے اور یہی حق وصواب ہے۔

باب سوم
ایصالِ ثواب کے سلسلے میں بے اعتدالیاں
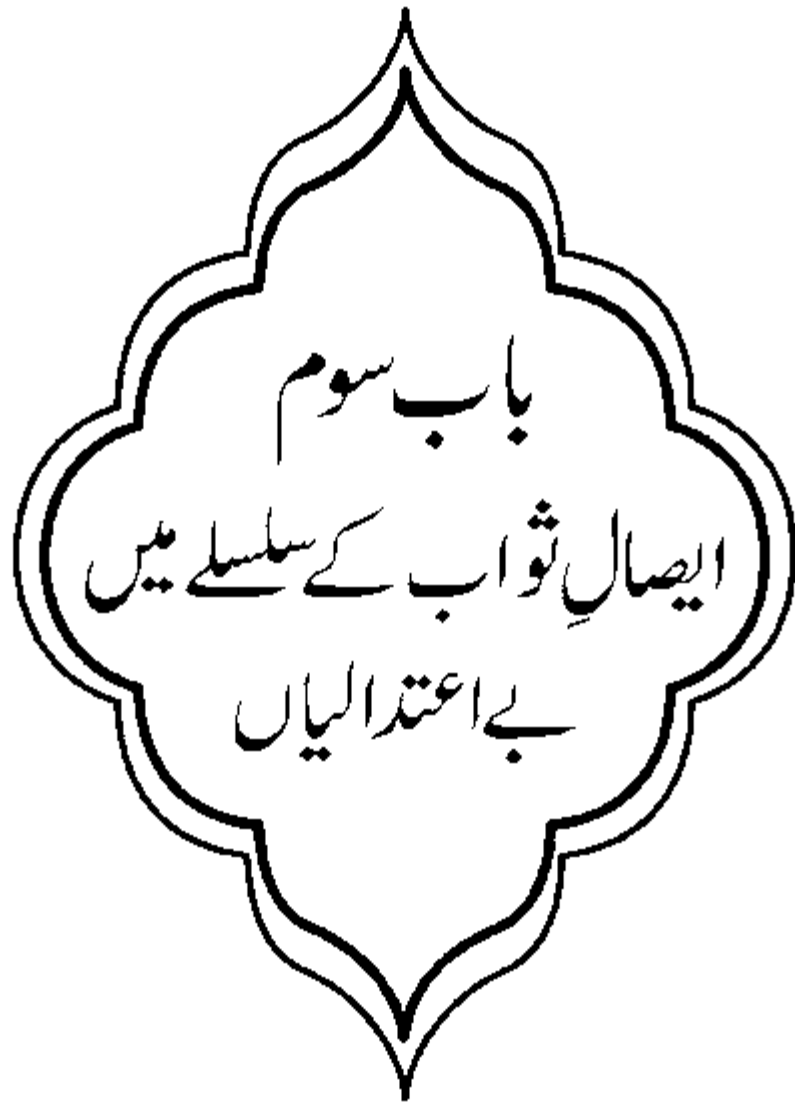
باب سوم

ایصال ثواب کے سلسلے میں بے اعتدالیاں

اب اخیر میں اس پر بھی تنبیہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایصال ثواب کے سلسلے میں بعض لوگ بے اعتدالیوں اور افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

ایک طبقہ تو وہ ہے جو ایصال ثواب کو بالکل من گھڑت و باطل کہہ جاتا ہے، اس کا جواب تو اوپر تفصیل سے گزر گیا اور ہمارا زیادہ تر مقصود اس تحریر سے یہی تھا۔

ایک اور طبقہ وہ ہے جو ایصالِ ثواب کے سلسلے میں افراط سے کام لیتا ہے اور اس کو اس کے حدود سے آگے لے جاتا ہے اور اس میں من گھڑت باتیں داخل کر کے اس شرعی چیز کو غیر شرعی عمل میں تبدیل کر دیتا ہے؛ لہٰذا یہاں یہ بھی مناسب معلوم ہوا کہ اس پر بھی مختصر کلام کر دیا جائے تا کہ علی وجہ البصیرۃ سمجھ میں آ جائے۔

ایصالِ ثواب کے لیے دن اور تاریخ کی تخصیص

ایک بے اعتدالی ایصالِ ثواب کے سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کے لیے دنوں اور تاریخوں کی تخصیص کرتے ہیں، جیسے موت کا تیسرا دن مقرر کرتے ہیں جس کو تیجہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح موت کے دسویں دن یا بیسویں دن یا چالیسویں دن کی تخصیص کی جاتی ہے اور اسی لحاظ سے ان کے نام بھی دسواں، بیسواں، چالیسواں رکھ دیا گیا ہے۔

یہ تخصیصات وقید بندیاں شریعت میں ثابت نہیں ہیں؛ کیوں کہ ایصالِ ثواب کے

لیے تو کسی وقت و دن کے تخصیص نہیں ؛ بل کہ ان تخصیصات کے بغیر ہی کوئی نیکی و طاعت کر کے اس کا ثواب مردوں کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بات دلائل سے اپنی جگہ ثابت ہے کہ کسی بھی عبادت و نیکی میں اپنی جانب سے تخصیصات و تقییدات مقرر کر لینا جائز نہیں ؛ بل کہ یہ دین میں ایجاد و اختراع ہے، جس کی مذمت واضح ہے۔

علامہ ابن دقیق العید نے "إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام" میں ایک طویل بحث لکھی ہے جس سے دلائل کی مختلف حیثیتوں کے ساتھ ساتھ احکام کے درجات کا بھی علم ہوتا ہے، انھوں نے اسی سلسلے میں بیان کیا ہے کہ

"جو احادیث سنن و نوافل کے سلسلے میں وارد ہیں، ان میں سے جو حدیثِ صحیح کسی خاص عدد یا خاص کیفیت پر دلالت کرتی ہے، اس پر استحباب کے درجے میں عمل کیا جائے گا۔ اور ان میں سے جو حدیث صحت کے درجے کو نہ پہنچی ہو تو وہ اگر حدیثِ حسن ہے اس پر بھی عمل کیا جائے گا جب تک کہ اس سے قوی کوئی حدیث اس کی معارض نہ ہو۔ اور اگر حدیث ضعیف ہو اور موضوع کے درجے کی نہ ہو تو اگر اس سے کوئی نیا دینی شعار پیدا ہوتا ہو تو اس کو نہیں لیا جائے گا اور اگر اس سے کوئی نیا شعار نہ پیدا ہو؛ (بلکہ کوئی نیک عمل ثابت ہوتا ہو) تو یہ صورت محلِ نظر و غور و فکر ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ضعیف حدیث سے جو نیک عمل ثابت ہو رہا ہے وہ عمومات نصوص میں داخل ہونے کی وجہ سے مستحب ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ "إن هذه الخصوصيات بالوقت أو بالحال والهيئة والفعل المخصوص يحتاج إلى دليل خاص يقتضي استحبابه بخصوصه، و هذا أقرب" (یہ وقت یا کیفیت و حالت اور مخصوص قسم کے کام کی خصوصیات جو دلیل خاص کی محتاج ہیں جس سے خاص طور پر اس کا استحباب ثابت ہو، اور یہی بات اقرب معلوم ہوتی ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ دین میں کوئی نیک عمل کسی خاص عدد و خاص کیفیت اور خاص وقت

(۱) إحكام الأحكام: ۱/ ۱۲۱-۱۲۲

کے ساتھ مخصوص ہو تو اگر یہ کسی حدیثِ صحیح یا حدیثِ حسن سے ثابت ہو تو اس کو اسی کیفیت وتخصیص کے ساتھ عمل میں لایا جائے گا اور وہ عمل مخصوص اگر حدیث صحیح یا حسن نہیں ؛ بل کہ حدیث ضعیف سے ثابت ہو تو یہاں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حدیث ضعیف سے ثابت شدہ اس مخصوص عمل کو عمومات نصوص کے تحت داخل مان کر اس کو مستحب قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس خاص کیفیت کے ساتھ اس عمل کو خاص دلیل کا محتاج قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ علامہ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ یہی بات اقرب ہے۔

پھر آگے چل کر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے جو عمومات کے تحت داخل ہونے کا احتمال ذکر کیا ہے، اس سے ہماری مراد نفس فعل ہے، یہ نہیں کہ اس مخصوص کیفیت کے ساتھ یہ مستحب ہے؛ کیوں کہ اس خاص کیفیت و ہیئت کے ساتھ اس کا مستحب ہونا دلیل شرعی کا محتاج ہے اور دلیل کا ہونا لازمی بات ہے۔(۱)

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی عمل کا مخصوص کیفیات اور مخصوص اوقات و حالات کے ساتھ مقید کرنا بلا دلیل جائز نہیں اور اس سلسلے میں کوئی حدیث ضعیف بھی کافی نہیں کہ کسی عمل خیر میں اس سے تخصیص وتقیید کی جائے۔

جب یہ واضح ہو گیا تو اب سمجھنا یہ ہے کہ مختلف قسم کے اعمال سے ایصالِ ثواب تو احادیث سے ثابت ہے؛ مگر اس کے لیے کوئی خاص کیفیت و حالت یا کوئی خاص دن و وقت کی قید ثابت نہیں ؛لہذا اس کو تین دن یا دس دن یا چالیس دن یا سال کے ساتھ تخصیص کرنا بے دلیل بات ہے اور اس کی شریعت میں اجازت نہیں ؛لہذا علما فرماتے ہیں کہ یہ تخصیصات و قیودات شریعت سے تعلق نہیں رکھتے ؛اس لیے ان تخصیصات وتقییدات کو ترک کر کے اصل مقصود پر دھیان دینا چاہیے کہ میت کو نفع پہنچے اور وہ پہنچتا ہے ان اعمال سے جن کا ذکر اوپر تفصیلاً کر دیا گیا ہے۔

---

(۱) إحکام الأحکام: ۱/۱۲۲

اسی لیے حضرات علمائے کرام نے ایصالِ ثواب کے لیے ایام و اوقات کی تعیین کو بدعت قرار دیا ہے۔

چناں چہ معروف حنفی فقیہ علامہ محمد نے "فتاوی بزازیة" میں لکھا ہے کہ

" وَيُكْرَهُ اتِّخَاذُ الطَّعَامِ فِي الْيَوْمِ الْأَوَّلِ وَالثَّالِثِ وَبَعْدَ الْأُسْبُوعِ وَنَقْلُ الطَّعَامِ إِلَى الْقَبْرِ فِي الْمَوَاسِمِ ، وَاتِّخَاذُ الدَّعْوَةِ لِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ وَجَمْعُ الصُّلَحَاءِ وَالْقُرَّاءِ لِلْخَتْمِ أَوْ لِقِرَاءَةِ سُورَةِ الْأَنْعَامِ أَوِ الْإِخْلَاصِ"

ترجمہ: موت ہونے کے بعد پہلے دن، تیسرے دن اور ہفتہ بعد کھانا تیار کرنا مکروہ ہے، نیز کھانا بنا کر قبروں کے پاس خاص خاص دنوں میں لے جانا اور تلاوت قرآن کے لیے دعوت کرنا اور صلحا اور قرا کو جمع کرنا یا سورہ انعام یا سورہ اخلاص پڑھنے کے لیے جمع کرنا، یہ سب مکروہ ہے۔(۱)

اور علامہ شامی نے "رد المحتار" میں انہی سے نقل کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"وَفِي الْبَزَّازِيَّةِ :وَيُكْرَهُ اتِّخَاذُ الطَّعَامِ فِي الْيَوْمِ الْأَوَّلِ وَالثَّالِثِ وَ بَعْدَ الْأُسْبُوعِ ، وَنَقْلُ الطَّعَامِ إِلَى الْقَبْرِ فِي الْمَوَاسِمِ ، وَاتِّخَاذُ الدَّعْوَةِ لِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ وَجَمْعُ الصُّلَحَاءِ وَالْقُرَّاءِ لِلْخَتْمِ أَوْ لِقِرَاءَةِ سُورَةِ الْأَنْعَامِ أَوِ الْإِخْلَاصِ"

ترجمہ: فتاوی بزازیہ میں لکھا ہے کہ موت ہونے کے بعد پہلے دن، تیسرے دن اور ہفتہ بعد کھانا تیار کرنا مکروہ ہے، نیز کھانا بنا کر قبروں کے پاس خاص خاص دنوں میں لے جانا اور تلاوت قرآن کے لیے دعوت کرنا

---

(۱) فتاوی بزازیة علی هامش الهندیة:۴/۸۱

اور صلحا اور قرا کو جمع کرنا یا سورہ انعام یا سورہ اخلاص پڑھنے کے لیے جمع کرنا، یہ سب مکروہ ہے۔(۱)

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "مدارج النبوۃ" میں لکھا ہے کہ

"یہ عادت وطریقہ نہ تھا کہ لوگ میت کے لیے جمع ہوکر قرآن پڑھیں اور ختم وغیرہ کریں، نہ قبر پر اور نہ قبر کے علاوہ کسی اور جگہ اور یہ سب امور بدعت ہیں، ہاں! میت کے گھر والوں کی تعزیت کے لیے جمع ہوں اور تسلی اور صبر کی تلقین کریں تو یہ سنت ومستحب ہے؛ لیکن خاص تیسرے دن مخصوص قسم کا اجتماع اور دیگر تکلفات کا ارتکاب اور یتیموں کے حق میں سے مال کا بلا وصیت خرچ کرنا، یہ سب بدعت وحرام ہے۔(۲)

اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے "فتاوی عزیزیہ" میں ایک سوال کا جواب دیا ہے جو فارسی میں ہے، اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

سوال: ربیع الاول کے ایام میں اللہ تعالی کے لیے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح یا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یا دیگر آل اطہار کے لیے ثواب پہنچانے کے لیے ایام محرم میں کھانا بنانا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: اس کام کے واسطے وقت یا دن کی تعیین کرنا یا کسی ماہ کو مقرر کرنا بدعت ہے۔ ہاں اگر ایسے وقت میں کوئی عمل کرے جس میں ثواب زیادہ ہوتا ہے جیسے ماہ رمضان کہ اس میں بندہ مؤمن کا عمل ستر گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ بقول حضرت امیر المؤمنین علی مرتضی

---

(۱) رد المحتار: ۲/۲۴۰

(۲) مدارج النبوۃ: ۱/۴۲۱، بحوالہ راہ سنت: ۲۶۶

(کرم اللہ وجھہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے۔
اور وہ چیز کہ اس کی صاحب شرع سے ترغیب اور تعیین وقت ثابت نہ ہو، وہ عمل عبث اور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے اور سنت رسول کی مخالفت حرام ہے۔ (۱)

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

"تیسرے یا پانچویں دن کو مخصوص کر لینا اور اس کو ضروری سمجھنا شریعت محمدیہ میں ثابت نہیں ہے "نصاب الاحتساب" کے مصنف نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے، پس طریقہ یہ ہے کہ تخصیص وتعیین نہ کریں، جس دن بھی چاہیں میت کو ایصال ثواب کر دیں؛ کیوں کہ مردہ ابتدائی تمام ایام میں ثواب کا زیادہ محتاج ہوتا ہے تو جس روز بھی ایصال ثواب ہوگا، مفید ہوگا۔"

اس کے بعد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وہی عبارت "شرح سفر السعادۃ" کے حوالے سے درج کی ہے جو اوپر ہم نے لکھی ہے۔ (۲)

ان فتاوی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایصال ثواب کے لیے ایام واوقات کی تخصیص نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ جب اللہ توفیق دے اور جو میسر آئے اس سے ایصال ثواب کر دیا جائے۔

ایصالِ ثواب کے لیے خاص طریقہ مقرر کرنا

ایصالِ ثواب کے لیے کوئی خاص طریقہ ایجاد کر لینا بھی روا نہیں، جیسے بعض لوگ ایصالِ ثواب کے لیے مخصوص اشیاء کی پابندی کرتے ہیں کہ اناج وغلہ دیا جائے، اسی طرح یہ کہ کوئی شیرینی ہو، پھر اس پر فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کیا جائے۔ یہ ساری قیودات وتخصیصات ایجاد بندہ کے قبیل سے ہیں، شریعت میں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

---

(۱) فتاوی عزیزیہ: ۹۷

(۲) فتاوی عبد الحي: ۱/۹۱

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں جو لکھا ہے، اس کو پڑھ لیں، پہلے سوال سن لیں:

سوال: حضرت بو علی شاہ قلندر کے فاتحہ کے لیے بعض لوگوں نے ایک خاص کھانا متعین کرلیا ہے، کیا بدون تعیین طعام ثواب نہیں پہنچ سکتا؟

اس کے جواب میں علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ نے یہ لکھا کہ

جواب: ایصال ثواب کے لیے کوئی طعام متعین نہیں، جو چیز بھی میسر ہو فی سبیل اللہ دے کر اس کا ثواب جس کو چاہے پہنچائے۔(۱)

اسی طرح علامہ عبدالحی لکھنوی ہی نے فاتحہ مروجہ یعنی کھانے کی اشیاء سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھ کر ایصال ثواب کے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ:

''موجودہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھا اور نہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں؛ بل کہ جن تین قرون کے بارے میں آپ نے خیر ہونے کی شہادت دی، ان تینوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اس زمانے میں بھی حرمین شریفین میں خواص کی عادت یہ نہیں ہے، اور اگر کوئی خاص اس طریقے سے کرتا ہے اس کا یہ فعل حرام نہ ہوگا؛ مگر اس کو ضروری سمجھنا برا ہے، بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھنا چاہیں اس کا ثواب میت کو پہنچا دیں اور کھانے کو صدقے کی نیت سے فقراء کو دے دیں اور اس کا ثواب میت کو پہنچا دیں۔(۲)

اور علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ''جامع البرکات'' میں لکھا ہے کہ۔

''سال یا چھ ماہ یا چالیس دن کے بعد ہمارے علاقوں میں جو پکوان کیا جاتا ہے اور برادری کے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس کو بھاجی کہتے

---

(۱) فتاوی عبد الحي:۱/۶۸

(۲) فتاوی عبد الحي :۱/۹۱

ہیں یہ قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ اس کو نہ کھایا جائے۔(۱)

الغرض جس طرح دنوں اور مہینوں کی تخصیص و تعیین اپنی جانب سے کر لینا برا اور بدعت ہے، اسی طرح ایصالِ ثواب کے لیے کسی مخصوص کھانے کی یا کسی خاص شکل کی تخصیص و تعیین بھی معیوب و بدعت ہے۔ لہٰذا اس قسم کی باتوں سے بچنا چاہیے؛ تاکہ بدعت کی زد میں نہ آئیں۔

ایک من گھڑت روایت

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ بعض لوگ کھانے پر فاتحہ پڑھنے کی ایک دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب زادے حضرت ابراہیم کی وفات کے تیسرے دن کچھ چیزوں کو سامنے رکھ کر فاتحہ دلائی اور اس کا ثواب صاحب زادے کو بخشا۔

چناں چہ مولانا محمد صالح نقش بندی نے اپنے رسالے "تحفة الأحباب" میں لکھا ہے کہ

"ملا علی قاری" "فتاوی اوزجندی" میں ارقام فرماتے ہیں کہ

> حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کا تیسرا دن یعنی تیجہ تھا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نبی کے پاس آئے، ان کے پاس اونٹنی کا دودھ اور جو کی روٹی تھی، پس اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھ دیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار پڑھی اور یہ درود شریف "پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور منہ مبارک پر پھیرے اور حضرت ابوذر کو حکم دیا کہ اس کو تقسیم کرو اور فرمایا کہ اس کھانے کا ثواب میرے بیٹے ابراہیم کے لیے ہے۔(۲)

---

(۱) بحواله فتاوی عبد الحي: ۱/۹۰

(۲) تحفة الأحباب: ۱۲۲

مگر یہ روایت من گھڑت ہے، اس کا کسی بھی حدیث کی کتاب میں ذکر نہیں ملتا اور نہ ملا علی قاری کی کوئی کتاب اس نام کی ہے۔ چناں چہ علامہ عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

''نہ کتاب اوزجندی از تصانیف ملا علی قاری ست، و نہ روایت مذکورہ صحیح ومعتبر ست؛ بل کہ موضوع ست و باطل، براں اعتماد نشاید۔ در کتب حدیث نشانے ازیں چنیں روایات یافتہ نمی شود''

ترجمہ: یعنی نہ کتاب اوزجندی ملا علی قاری کی تصانیف میں سے کوئی کتاب ہے اور نہ یہ روایت صحیح ومعتبر ہے؛ بل کہ موضوع و باطل ہے، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کتب احادیث میں اس جیسی روایات کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ (۱)

ایک اور من گھڑت روایت

بعض لوگوں نے ایک اور من گھڑت حدیث اس سلسلے میں پیش کی ہے، چناں چہ مولانا عبد السمیع صاحب نے ''انوار ساطعة'' میں لکھا ہے کہ

''حاشیۂ خزانۃ الروایات اور بعض رسائل میں اس عاجز کی نظر سے یہ روایت مجموع الروایات کی گزری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے لیے تیسرے دن اور دسویں، چالیسویں روز اور چھٹے مہینے اور برسویں دن صدقہ دیا۔ اگر یہ حدیث کسی قدر لائق اعتماد ہے تو یہ سب رسمیں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو گئیں۔ (۲)

مگر افسوس ہے کہ اس حدیث کا نہ تو حوالہ کسی معتبر حدیث کی کتاب سے دیا، نہ اس کے الفاظ ہی نقل کیے اور نہ اس کا درجہ بتایا اور ظاہر ہے کہ حدیث کا معاملہ اس قدر آسان نہیں

---

(۱) مجموعة فتاوی عبد الحي: ۲/۱۷۵

(۲) انوار ساطعه: ۱۲۵

کہ بلا حوالہ ذکر کر دیا جائے؛ جب کہ خود صاحب انوار ساطعہ کو حدیث کا کیا درجہ ہے، اس کا علم نہیں، اس لیے وہ خود یہ الفاظ لکھ گئے کہ ”اگر یہ حدیث کسی قدر قابل اعتماد ہوالخ“ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود اس کا کوئی علم نہیں کہ یہ حدیث کس درجے کی ہے؟

اور رہا حوالہ خزانۃ الروایات کے حاشیہ کا تو یہ اور بھی عجیب بات ہے؛ کیوں کہ یہ کس کا حاشیہ ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، پھر اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ خود خزانۃ الروایات کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے؛ بل کہ فقہ حنفی کی کتاب ہے جو علامہ قاضی جگن گجراتی حنفی کی تصنیف ہے اور اس کی احادیث بلا تحقیق نقل نہیں کی جا سکتیں، اس لیے کہ اس میں ہر طرح کی روایات موجود ہیں۔

علامہ عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے "النافع الکبیر علی الجامع الصغیر" کے مقدمہ میں خزانۃ الروایات کے علاوہ اور بھی متعدد کتب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں یہ تبصرہ لکھا ہے کہ

”فإن هذه الكتب مملوءة من الرطب واليابس مع ما فيها من الأحاديث المخترعة والأخبار المختلفة“

ترجمہ: یہ سب کتابیں رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں، ساتھ ساتھ اس کے کہ ان میں من گھڑت احادیث اور اختلافی روایات ہیں۔(۱)

اسی طرح مجموع الروایات بھی کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے اور نہ فقہی کتب میں قابل اعتبار کتاب ہے۔

ایصالِ ثواب کے لیے اجرت پر تلاوت

ایصالِ ثواب کے واسطے اجرت پر تلاوت کرانے کا رواج بہت سے لوگوں میں پایا جاتا ہے، مگر یہ رواج شرعاً نا قابل اعتبار اور خلاف شرع ہے۔

---

(۱) النافع الکبیر: ۳۰

چناں چہ فقہا و علما نے تصریح کی ہے کہ تلاوت پر اجرت کا لینا و دینا جائز نہیں ہے اور اس سے تلاوت کرنے والے کو اس کا ثواب ہی حاصل نہیں ہوتا، جب خود تلاوت کرنے والے کو اجرت لینے کی وجہ سے ثواب نہیں ملتا تو کسی اور کو اس کا ثواب پہنچانے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے "رد المحتار" میں نقل کیا ہے کہ علامہ تاج الشریعہ نے "شرح ہدایہ" میں لکھا ہے کہ

"إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ."

ترجمہ: اجرت پر قرآن کی تلاوت سے ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا، نہ تو میت کے لیے اور نہ پڑھنے والے کے لیے۔(۱)

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے "رد المحتار" میں لکھا ہے کہ

"وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، و الآخذ و المعطي آثمان. فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراء ة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستأجر.

ترجمہ: دنیا کی خاطر پڑھنے والے کو روکا جائے گا اور تلاوت پر اجرت لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہیں، حاصل یہ کہ ہمارے زمانے میں جو رائج ہو گیا ہے کہ قرآن کے اجزاء و پارے اجرت پر پڑھتے ہیں .... یہ جائز نہیں، پس جب پڑھنے والے ہی کو نیت صحیحہ نہ ہونے کی وجہ سے ثواب حاصل نہیں تو اجرت پر پڑھانے والے کو کہاں سے ثواب ملے گا۔(۲)

---

(۱) رد المحتار: ۶/ ۵۶

(۲) رد المحتار: ۹/ ۷۷

علامہ محمود آلوسی البغدادی الحنفی اپنی تفسیر "روح المعاني" میں فرماتے ہیں کہ

" ثم الظاهر أن ذلك إذا لم تكن القراءة بأجرة ، أما إذا كانت بها كما يفعله أكثر الناس اليوم ؛ فإنهم يعطون حفظة القرآن أجرة ليقرؤوا لموتاهم، فيقرؤون لتلك الأجرة ، فلا يصل ثوابها ؛ إذ لا ثواب لها ليصل ؛ لحرمة أخذ الأجرة على قراءة القرآن."

ترجمہ: پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ جواز اس صورت میں ہے، جب کہ قراءت اجرت کے ساتھ نہ ہو اور رہی وہ قراءت جو اجرت پر ہو جیسا کہ اکثر لوگ آج کل کرتے ہیں، پس لوگ حفاظ قرآن کو اجرت دیتے ہیں کہ وہ ان کے مرحومین کے لیے قرآن پڑھیں اور یہ حفاظ اجرت کے لیے قراءت کرتے ہیں تو اس سے ثواب نہیں پہنچتا؛ کیوں کہ اس قراءت کا ثواب ہی نہیں جو پہنچے؛ کیوں کہ قرآن کی قراءت پر اجرت لینا حرام ہے۔(۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ

" لا يصح الاستئجار على القراءة وإهدائها إلى الميت ؛ لأنه لم ينقل عن أحد من الأئمة الإذن في ذلك ، وقد قال العلماء : إن القارئ إذا قرأ لأجل المال فلا ثواب له فأي شيء يُهدى إلى الميت ؟ وإنما يصل إلى الميت العمل الصالح ، والاستئجارُ على مجرد التلاوة لم يقل به أحد من الأئمة.

ترجمہ: اجرت پر قرآن پڑھوانا اور اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرنا صحیح نہیں ؛ کیوں کہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی سے بھی منقول نہیں

(۱) روح المعاني:۱۴/۶٦

ہے،اور علما نے فرمایا کہ قاری اگر مال کے واسطے تلاوت کرتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا ،تو وہ کیا چیز میت کو ہدیہ کرے گا ؟ جبکہ میت کو عمل صالح پہنچتا ہے اور محض تلاوت پر اجرت کے معاملے کا کوئی بھی امام قائل نہیں ۔(۱)

ان تمام عباراتِ اکابر سے یہ بات روزروشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت پر اجرت لینا و دینا جائز نہیں اور اس سے تلاوت کا ثواب بھی حاصل نہیں ہوتا اور جب خود تلاوت کر نے والے کو ثواب نہیں ملتا تو وہ کسی اور کو کیا بخش سکتا ہے؟لہٰذا جو رواج بعض لوگوں میں ہے کہ اجرت پر طلبا و حفاظ سے تلاوت کراتے ہیں اور اس سے ایصال ثواب کرتے ہیں، یہ جائز نہیں اور نہ کوئی نفع بخش کام ہے،لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

ایک اہم افادہ

یہاں ایک تنبیہ ضروری ہے کہ علمائے کرام نے جو بعض طاعات جیسے امامت واذان اور تعلیم قرآن وحدیث پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے، یہ دراصل شرعی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہے اور وہ شرعی ضرورت یہ ہے کہ یہ عبادات یعنی امامت و اذان و تعلیم قرآن وغیرہ اگر اجرت پر نہ کرائے جائیں تو کوئی امام ومؤذن ومعلم دست یاب نہ ہو سکے گا ؛ کیوں کہ یہ لوگ اپنی ضروریات زندگی کی تحصیل کے لیے جب نکل جائیں گے تو کون امامت واذان دینے والا ملے گا اور کون قرآن وسنت کی تعلیم دینے والا میسر آئے گا ؟ جب ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے میسر نہ ہوں گے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ مساجد میں نہ اذان ہوگی، نہ جماعت قائم ہوگی ، نہ مدارس ومکاتب میں قرآن وسنت اور دین وشریعت کی تعلیم ہوگی ، نہ کوئی وعظ ونصیحت واصلاح وتزکیہ کا نظام چلے گا ، الغرض دین ہی قائم نہ رہ سکے گا اور یہ سب کو معلوم ومسلم ہے کہ دین وشریعت کو دنیا میں باقی وقائم رکھنا امت کا اہم ترین فریضہ ہے ، جس سے غفلت کسی طور برداشت نہیں کی جا سکتی ، لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر دین کو

(۱) الفتاوی الکبری:۵/۴۰۸

باقی رکھنا ہے تو امامت واذان اور تعلیم قرآن کی اجرت دے کر ان کاموں کو جاری رکھنا امت پر فرض ہے، اس ضرورت کی وجہ سے علما نے تعلیم قرآن پر اجرت کے لینے و دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواز صرف انھیں چیزوں تک محدود ہے جن میں یہ شرعی ضرورت لاحق ہے، ہر نیکی و طاعت پر اجرت کا جواز علما نے بیان نہیں کیا ہے۔

علامہ شامی نے کس قدر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، ان کی عبارت ملا حظہ کیجیے، آپ فرماتے ہیں کہ

" وَقَدْ اتَّفَقَتْ كَلِمَتُهُمْ جَمِيعًا عَلَى التَّصْرِيحِ بِأَصْلِ الْمَذْهَبِ مِنْ عَدَمِ الْجَوَازِ، ثُمَّ اسْتَثْنَوْا بَعْدَهُ مَا عَلِمْتَهُ ، فَهَذَا دَلِيلٌ قَاطِعٌ وَبُرْهَانٌ سَاطِعٌ عَلَى أَنَّ الْمُفْتَى بِهِ لَيْسَ هُوَ جَوَازُ الاسْتِئْجَارِ عَلَى كُلِّ طَاعَةٍ ؛ بَلْ عَلَى مَا ذَكَرُوهُ فَقَطْ مِمَّا فِيهِ ضَرُورَةٌ ظَاهِرَةٌ تُبِيحُ الْخُرُوجَ عَنْ أُصُلِ الْمَذْهَبِ مِنْ طُرُوِّ الْمَنْعِ ."

ترجمہ : تمام علما کی عبارات اس بات کی تصریح پر متفق ہیں کہ اصل مذہبِ حنفیہ طاعات پر اجرت کا عدم جواز ہے، پھر اس کے بعد انھوں نے ان امور کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے جو تم نے معلوم کیا، لہذا یہ اس بات کی دلیل قاطع اور برہان ساطع ہے کہ مفتی بہ قول یہ نہیں ہے کہ ہر طاعت پر اجرت کا معاملہ جائز ہے؛ بلکہ صرف ان طاعات پر یہ جائز ہے جن میں ایسی واضح ضرورت پائی جائے جس کی بنا پر اصل مذہب سے جو کہ منع کا طاری ہونا ہے اس سے خروج کو جائز قرار دے۔ (۱)

اس سے معلوم ہو گیا کہ امامت و اذان اور تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت کا جواز ایک ضرورت شرعی کی وجہ سے ہے اور یہ جواز انہی امور تک محدود ہے جن میں ایسی ضرورت پیش آئے، لہذا جہاں وہ ضرورت نہیں ہے وہاں بھی نیکی وطاعت پر اجرت لینے و دینے کو جائز سمجھنا غلط ہے۔

(۱) شامي:٦/٥٦

اب رہی یہ بات کہ پھر پہلے زمانے میں ان امور پر اجرت کو کیوں نا جائز کہا گیا تھا، کیا یہ ضرورت پہلے دور میں موجود نہیں تھی؟ تو جواب یہ ہے کہ ہاں! پہلے دور میں یہ ضرورت لاحق نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ اس دور میں علماء و ائمہ کو اور تعلیم قرآن و سنت کے معلمین کو اسلامی حکومتیں وظیفہ جاری کرتی تھیں اور ان ذمہ داران مناصب کو اپنی معاشی ضروریات کے لیے معاشی تگ و دو کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے وہ حضرات اپنی ان ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، لیکن جب اسلامی مملکتوں میں بے راہ روی پیدا ہوئی اور وہ دینی امور کی نگہ داشت کی اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوگئیں اور ائمہ وعلما کو وظیفہ دینا بند کر دیا تو لوگوں کو ضرورت معلوم ہوئی کہ ان مناصب پر فائز حضرات کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کا نظام بنایا جائے اور ان کو ان کی ان خدمات کی بجا آوری میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔

جب یہ صورت حال پیش آئی تو علما وفقہا نے اجرت پر ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے جواز کا فتوی دیا، جن کا ذکر اوپر ہم کر آئے ہیں۔

فقیہ جلیل علامہ محمود بن احمد البخاری نے "المحیط البرهاني" میں اس مسئلہ پر خوب روشنی ڈالی ہے، وہ امام ابو بکر محمد بن الفضل بخاری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"كان المتأخّرُون من أصحابنا يُجوّزُون ذلك، و يقُولُون: إنما كان المتقدّمُون يكرهُون ذلك؛ لأنّه كان للمُعَلِّمين عطياتٌ من بيت المال، و كانوا مُستَغْنِينَ عمّا لا بُدّ لهم من أمر معاشهم، وقد كان في الناس رغبةٌ في التعليم بطريق الحسبة، و للمُتَعلّمين مروءةٌ في المجازاة بالإحسان من غير شرط، أمّا اليوم ليس لهم عطياتٌ من بيت المال، و التعليمُ يُشْغِلُهُم عن اكتساب ما لا بُدّ لهم من أمر المعاش، و انقطع رغبة المُعلّمين في الاحتساب، و مجازاة المتعلمين

من غير شرط ، فتجوز الإجارة ويجبر المستأجر على دفع الأجرة ، و يُحْبَسُ بها ، و به يُفتىٰ .

ترجمہ: ہمارے اصحاب میں سے متاخرین نے اس (طاعات پر اجرت لینے دینے) کی اجازت دی ہے اور یہ حضرات فرماتے ہیں کہ متقدمین نے اسے اس لیے مکروہ قرار دیا تھا کہ اُس زمانے میں اُستادوں کے لیے بیت المال سے وظیفہ جات مقرر تھے اور وہ لوگ ان کے ضروری معاشی امور کے سلسلے میں مستغنی تھے اور اُن لوگوں میں حسبۃً للہ تعلیم دینے کی رغبت تھی اور طالب علموں میں بلا شرط احسان کا بدلہ دینے کا جذبہ تھا، لیکن آج اساتذہ کے لیے بیت المال سے وظیفہ جات نہیں ہیں ، اور تعلیمی خدمت ان کو اپنے ضروری معاش میں لگنے سے باز رکھتی ہے اور ان معلمین کی للہ فی اللہ کام کرنے کی رغبت اور شاگردوں کا بلا شرط اساتذہ کے احسان کا بدلہ دینے کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، لہذا ان نیکیوں پر اجارہ جائز ہے اور ان طاعات کی اجرت دینے پر لوگوں کو مجبور کیا جائے گا اور نہ دینے پر قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے اور فتویٰ بھی اسی پر ہے۔(۱)

امام قاضی خان نے بھی اس کی یہی تفصیل بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ

"إنما كره المتقدمون الاستيجار لتعليم القرآن و كرهوا أخذ الأجر على ذلك ؛ لأنه كان للمعلمين عطيات في بيت المال ، في ذلك الزمان ، و كان لهم زيادة رغبة في أمر الدين وأقامة الحسبة ، و زماننا انقطعت عطياتهم و انتقصت رغائب الناس في أمر الآخرة ، و لو اشتغلوا بالتعليم بالحاجة إلى مصالح المعاش لاختل معاشهم.

(۱) المحيط البرهاني:۸/۶۲

ترجمہ: متقدمین نے تعلیم قرآن پر اجرت کے معاملے کو مکروہ اس لیے قرار دیا اور اس پر اجرت لینے کو اس لیے مکروہ سمجھا تھا کہ اس زمانے میں معلمین کے لیے بیت المال میں وظیفہ مقرر تھا اور ان حضرات کو دینی امور میں زیادہ رغبت اور حسبۃً للہ کام کرنے کا جذبہ تھا اور ہمارے زمانے میں وظیفے ختم ہو گئے اور لوگوں کی اخروی امور میں دلچسپی کم ہو گئی ہے اور اگر یہ لوگ تعلیم کا کام چھوڑ کر مصالح معاش کی ضروریات میں مشغول ہو جائیں تو ان کے معاشی نظام میں خلل واقع ہوگا۔(۱)

ان تمام عبارات سے اصل مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مذہب تو طاعات پر اجرت کا عدم جواز ہی ہے، اور جو جائز قرار دیا گیا وہ دراصل حالات زمانے میں تبدیلی کی وجہ سے اور ایک خاص ضرورت کے تحت ہے اور وہ ضرورت دینی امور میں مشغولی کی وجہ سے معلمین و دیگر دینی امور کی نگہداشت رکھنے والوں کے نظام معاش کا مختل ہو جانا ہے۔ لہذا جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں اس کا جواز ہوگا اور جہاں یہ علت مفقود ہوگی وہاں جواز بھی نہ ہوگا۔

اور اوپر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تلاوت قرآن کے لیے اجرت کی اجازت نہیں؛ کیوں کہ اس سے کسی نظام دینی میں خلل نہیں پڑتا اور نہ تلاوت کرنے والے کا کوئی نظام معاش میں خلل متحقق ہے۔

اختتام اور دعاء

الحمدللہ! ایصالِ ثواب کے مسئلے سے متعلق یہ تفصیلی کلام قرآن وحدیث اور فقہا امت کے اقوال ومسالک کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور اس میں ہم نے جمہور اہل علم کے مسلک کی وضاحت پیش کی ہے، وہ اہل علم جن پر فتوی کا مدار اور ان کے تشریحات وتحقیقات پر

---

(۱) فتاوی خانیۃ: ۲۵۶/۳

علمی مسائل کا انحصار ہے، ہم نے اس میں کوئی تفرد اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل انہی اکابر ائمہ واسلاف کی تحقیقات کا نچوڑ وخلاصہ اور لب لباب ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی اس رسالے سے حق کے متلاشیوں کو راہ حق دکھائے اور ہم سبھی کو راہ حق پر چلنے اور اسی پر مرنے کی توفیق ارزاں فرمائے، آمین یارب العالمین۔